برصغیر کا اسلامی ادب
چند نامور شخصیات
پروفیسر ڈاکٹر محمد مجیب الرحمن
تحقیق و ترتیب
پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف صدیق
نقوش

برِّ صغیر کا اسلامی ادب - چند نامور شخصیات

پروفیسر ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن

سابق صدر شعبۂ عربی و اسلامیات

راج شاہی یونیورسٹی بنگلہ دیش

ریلیجیس ڈائریکٹر اسلامک کلچرل سنٹر

نیویارک، امریکہ

تحقیق و ترتیب: ڈاکٹر محمد یوسف صدیق

ہائیر ایجوکیشن کمیشن پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب

پبلشر

نام کتاب | برصغیر کا اسلامی ادب --- چند نامور شخصیات
اشاعت | اوّل
سن اشاعت | مئی 2010ء
پبلشر | نقوش۔ اُردو بازار لاہور
مطبع | نقوش پریس۔ اُردو بازار لاہور
قیمت | 400/- روپے

فہرست

انتساب

لاہور کے ادبی حلقہ کی ایک مایہ ناز شخصیت، شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا، انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا، اور دیگر متعدد کتب کے مؤلف جناب سید قاسم محمود مرحوم کی نذر، جن کی علمی وادبی مدد کے بغیر اس تحقیق کو اردو میں منظر عام پر آنا ممکن نہ تھا۔

اور

لکھوی خاندان کے علماء و مشائخ و بزرگان کے نام جنہوں نے برِّصغیر میں دینی علوم کے فروغ کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔

اظہار تشکر

یہ میرے فرزند عزیز اور، جامعہ پنجاب کے شعبہ علوم اسلامیہ کے ایچ ای سی (H.E.C.) پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف صدیق تھے جنہوں نے نہ صرف میرے اردو مقالات کو ایک کتابی شکل میں چھاپنے کی ہمت بندھائی، بلکہ پوری کتاب کی از سر نو تحقیق و ترتیب اور نظر ثانی کا اہتمام کیا اور اس کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔ اور ساتھ ساتھ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب کے ڈاکٹر محمد حماد لکھوی اور ان کی اہلیہ زاہدہ لکھوی، ڈاکٹر حمود لکھوی (گورنمنٹ کالج اوکاڑہ) اور ان کی اہلیہ عادلہ لکھوی، جناب بارک اللہ انجم لکھوی، ڈاکٹر عابد لکھوی اور ڈاکٹر زاھد لکھوی اور لقمان مسعود لکھوی کا بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کو لکھنے میں مجھے اس طرح کی سہولتیں پہنچائیں اور پاکستان میں مختلف وقت قیام کے دوران خاص خیال رکھا۔

میں خاص طور پر اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جامعہ پنجاب کے ڈاکٹر محمد ارشد، اور شعبۂ علومِ اسلامیہ، جامعہ پنجاب کے ڈاکٹر محمد سعد صدیقی کا خاص طور پر ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کو موجودہ شکل میں منظر عام پر لانے کے لئے بھرپور تعاون کیا۔

اس سلسلے میں میں مریم احمد (ایم فل، شعبہ علومِ اسلامیہ، جامعہ پنجاب لاہور)، عذرا پروین (ایم فل، شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب لاہور) اور ان کے خاوند عبدالقیوم سنامی صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں، جنہوں نے پوری کتاب کو ترتیب دینے میں مدد کی۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری (وائس چانسلر، جامعہ سرگودھا) مولانا محمد اسحاق بھٹی، ڈاکٹر حافظ حسن مدنی، جناب مدثر حسین سیان (ایم فل، شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لیکچرار گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ لاہور)، مولانا عزیز شمس (از بہار، بھارت اور حالیہ مقیم درمکہ مکرمہ)، جناب منیر احمد (ایم فل، شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لیکچرار، رینالہ خورد کالج)، جناب مدثر علی (جنہوں نے شعبہ علوم اسلامیہ سے 2009ء میں ایم اے حاصل کیا ہے) اور ان تمام متعلقہ حضرات کا ذاتی طور پر شکر گزار ہوں جنہوں نے نہایت خوش دلی سے میری طرف دست تعاون بڑھایا اور میرے لئے مدد و معاون بنے رہے۔

شکر گزار

ڈاکٹر محمد مجیب الرحمن

نیویارک، امریکہ

پیش لفظ

تیرہ سو سال پر محیط برصغیر میں اسلام اور اسلامی شخصیات کی داستان تاریخ اسلام میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی ابتداء محمد بن قاسم الثقفی جیسے مہم جو اور انتہائی قابل قائد سے ہوتی ہے اور پھر سندھ کے راستے پورے برصغیر میں اسلام پھیل جاتا ہے جس کی ایک زندہ تصویر پاکستان اور جنوبی ایشا کے مشرقی حصے میں بنگلہ دیش کی موجودگی ہے جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کی دوسری اور تیسری سب سے بڑی آزاد مسلمان جمہوری ریاستیں ہیں۔ دنیا بھر کے کلمہ گو مسلمانوں کی مجموعی تعداد کے ایک تہائی سے زیادہ لوگ جنوبی ایشیا کے اسی حصے (جسے ہم برصغیر کہتے ہیں) میں بستے ہیں۔

"برصغیر میں اسلام" کے موضوع پر کئی مصنفین نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق لکھا ہے لیکن اب بھی کافی تحقیقی کام ہونا باقی ہے۔ 'ڈاکٹر مجیب الرحمن' نے اسی موضوع سے متعلق اردو زبان میں ایک دلچسپ علمی کتاب کا اضافہ کیا ہے جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ اردو کے ساتھ برِصغیر کے مسلمانوں کا ایک خاص علمی اور جذباتی لگاؤ ہے جو کسی حد تک عشق کی سطح تک پہنچتا ہے اور یہ کتاب انہی جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ یہاں قابل الذکر بات یہ ہے کہ مؤلف بنگال کے باسی ہیں، ان کی مادری زبان بنگلہ ہے اور اُن کا اکثر و بیشتر حصہ "راج شاہی یونیورسٹی" بنگلہ دیش میں تدریس و تحقیق میں گزرا ہے لیکن اس کے باوجود اُنکی اردو سے والہانہ عقیدت نے اُن کو اردو میں لکھنے کی ہمت بندھائی۔ نتیجتاً ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بنگالی عالم کے قلم سے اردو

قارئین کے لیے برصغیر کے چند اہل نظر علما کے تذکار پر مشتمل یہ شاندار کتاب شائع ہو کر منظر عام پر آ رہی ہے۔

اس کتاب میں چند ایسے علماء اور اسلامی شخصیات کے سوانح اور علمی کارنامے بیان کئے گئے ہیں جن کے متعلق اس سے پہلے اردو میں زیادہ کچھ نہیں لکھا گیا ہے اور اسی لیے یہ کتاب اُن قارئین کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے جو ان شخصیات پر مزید کچھ تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں۔

بنگال کے باسی ڈاکٹر محمد مجیب الرحمن کا اردو قارئین کے لیے یہ ایک انمول تحفہ پیش کرنے پر ہم اُن کے بے حد شکر گزار ہیں۔

خاکسار

محمد یوسف صدیق بن محمد مجیب الرحمن

ایچ ای سی، پروفیسر

شعبہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ایچ ای سی پروجیکٹ ڈائریکٹر و ایڈیٹر "برصغیر میں اسلام"

ڈاکٹر محمد مجیب الرحمن: چند تعارفی کلمات

اس کتاب کے مؤلف ڈاکٹر محمد مجیب الرحمن 1936ء میں ریاست مغربی بنگال کے ضلع "مالدہ" کے ایک دور افتادہ گاؤں "بابلہ بونا" میں پیدا ہوئے، ان کی پیدائش کے زمانے کا برصغیر سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور تاریخی لحاظ سے موجودہ زمانے سے بہت ہی مختلف تھا، اتنا ہی مختلف کہ مؤلف محمد مجیب الرحمن کے بارے میں یہاں کچھ لکھنا بذات خود اس زمانے کی تاریخ کا ایک دلچسپ تذکرہ ہوگا۔ اِس کے علاوہ یہ تذکرہ کتاب کے ہدف یعنی برصغیر کے علماء کی علمی خدمات کے مناقشہ کو سمجھنے میں خاصہ مددگار ہوگا۔ بلکہ یوں کہہ لیں کہ اس زمانہ کے بنگال میں مشہور علمی گھرانوں کی علمی سرگرمیوں کا ایک نمونہ بھی اِسی بہانے قارئین کے سامنے پیش کرنے کا موقع مل جائے گا۔

مجیب الرحمن صاحب کے والد مولانا عبدالغنی دیوبند کے ان فارغ التحصیل علماء میں سے تھے جو بیسویں صدی کے پہلے نصف میں بنگال کے "مالدہ" "مرشد آباد" اور "راج شاہی" اضلاع میں دعوۃ وتبلیغ کے سلسلے میں کافی سرگرم رہے اور مختلف دینی مدارس میں تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ مصنف کے دادا مولانا ایوب حسین کا شمار بھی بنگال کے سرگرم علماء میں ہوتا تھا جو کہ جہادی جذبات سے لبریز تھے۔ شجرۂ نسب کچھ یوں تھا: محمد مجیب الرحمن ابن مولانا عبدالغنی ابن مولانا ایوب حسین ابن حاجی شادت منڈل ابن بلاقی منڈل ابن نظام الدین منڈل ابن عبدالکریم منڈل ابن حیدر علی خان۔

مصنف کی ابتدائی تعلیم راج شاہی کے مختلف دینی مدارس میں ہوئی۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے اُن کی علمی صلاحیتیں ابھری ہوئی نظر آتی تھیں۔ بنگلہ زبان میں شعر و شاعری کا ذوق شروع سے ہی مصنف کو رہا۔ 1951ء کے لگ بھگ ڈھاکہ کی ایک مشہور دینی درس گاہ "مدرسہ عالیہ" (جو ایک سرکاری مدرسہ بھی تھا) میں داخلہ لیا۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد پاکستان کے صوبہ پنجاب میں شہر اوکاڑہ میں واقع "جامعہ محمدیہ" اور اس کے بعد جامعہ سلفیہ لائل پور (فیصل آباد) میں دینی تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران عملی زندگی کے تقاضے پورا کرنے کے لیے انہوں نے ضلع اوکاڑہ کے ایک دور افتادہ گاؤں میں ایک سرکاری ہائی سکول میں تدریس کا آغاز کیا اور 1960ء تک لاہور منتقل ہو گئے جہاں جامعہ اہلحدیث مسجد قدس چوک دال گراں (نزد ریلوے سٹیشن لاہور) میں تدریس حدیث و عربی زبان و ادب کا سلسلہ شروع کیا۔ اُن کے اس زمانے کے شاگردوں میں سے مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی مہتمم جامعہ لاہور الاسلامیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس زمانے کی چند مشہور اور ممتاز شخصیات، جیسا کہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی (وفات 1963ء)، مولانا محی الدین احمد قصوری (وفات 1971ء)، سید ابو بکر غزنوی (وفات 1976ء) مولانا محمد حنیف ندوی (وفات 1987ء) سے بھی ان کی وابستگی رہی جنہوں نے ان کی علمی اور عملی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے۔

1962ء میں مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) واپس جانے کے بعد انہوں نے پہلے "چپائی نواب گنج کالج" اور پھر "راج شاہی یونیورسٹی" میں عربی اور اسلامیات کا تدریسی فریضہ انجام دینا شروع کیا۔ اس دوران انہوں نے بے شمار بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور بنگلہ زبان میں یکے بعد دیگرے مختلف تصنیفات

کا سلسلہ جاری رکھا۔ بنگلہ زبان میں اُن کا ترجمہ کیا ہوا قرآن کریم، مکتبہ دارالسلام نے ریاض(سعودی عرب) سے شائع کیا ہے جو کہ اس زبان کے بہترین ترجموں میں شمار ہوتا ہے۔ 'تفسیر ابن کثیر' اور 'رحمۃ اللعالمین' جیسی اہم کتب کو بنگلہ زبان میں منتقل کر کے انہوں نے بہت بڑی علمی خدمت بھی انجام دی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف محدثین کی حیات و علمی خدمات، عربی زبان وادب کی تاریخ، اعجاز القرآن اور دیگر اسلامی مضامین پر ان کی تصنیف کردہ بے شمار کتابیں بنگلہ زبان میں شائع ہوئی ہیں۔

اُن کا سلسلہ تلامیذ بھی کافی وسیع ہے۔ اُن کی نگرانی میں کئی محققین نے پی۔ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالات مکمل کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

1993ء میں مجیب الرحمن نے نیو یارک (امریکہ) کو اپنا مرکزِ عمل بنایا جہاں وہ تاحال دعوۃ و تبلیغ اور علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔[1] اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے نیک اعمال کی جزائے خیر عطا کرے اور اسلام اور انسانیت کی مزید خدمت کرنے کی ہمت مرحمت فرمائے، آمین۔

عرض گزار

محمد یوسف صدیق بن محمد مجیب الرحمن

حوالہ جات

[1] ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے۔ محمد اسحاق بھٹی، حرف چند، مولانا محمد علی جوناگڑھی، (تالیف: محمد مجیب الرحمن) دارالدعوۃ السلفیہ شیش محل روڈ لاہور۔ 2003ء

سخن گفتنی

(از مؤلف)

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے اب تک اسلام کی ترویج واشاعت، دعوۃ و تبلیغ، علمی تصانیف اور مختلف مدارس و جامعات کے قیام کے حوالے سے علماء کرام کا کردار شاندار رہا ہے۔ کم و بیش ہر علمی شعبہ میں ان کی خدمات موجود ہیں۔ کتابِ ہذا میں انہی علماء کرام میں سے اُن چند ہستیوں کی علمی خدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جنہوں نے علمِ حدیث ودیگر علوم دینیہ کی ترویج واشاعت میں نمایاں طور پر حصہ لیا۔ ان میں بنگال کی بھی چند نامور ہستیاں شامل ہیں جن سے اردو دان طبقہ کی واقفیت بہت کم رہی ہے۔ ان میں سے چند شخصیات کے ساتھ مصنف کا ذاتی تعلق بھی رہا ہے۔ 'مولانا محمد جونا گڑھی' مصنف کے خُسر بھی تھے لیکن حیف صد حیف کہ مصنف کی کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی چونکہ اُن کی بیٹی بلقیس بیگم کی مصنف سے شادی کے کافی عرصہ قبل اُن کی وفات ہو چکی تھی۔ اسی طرح مولانا محی الدین احمد قصوری جیسی ہستیوں کا براہِ راست اثر مصنف پر زندگی بھر رہا۔

یہاں یہ بات عرض کرنا بھی مناسب سمجھوں گا کہ اردو میری مادری زبان کبھی بھی نہیں رہی لیکن بنگال کے علمی خاندانوں میں اردو کا چرچا ہمیشہ رہا۔ بچپن سے ہم اردو شعر و شاعری اور ادب کے ذوق میں پلے بڑھے ہیں۔ گھر کا ماحول ایسا تھا کہ اقبال، حالی اور دوسرے کئی شعراء کے اشعار جھوم جھوم کر پڑھے جاتے تھے جس میں خواتین بھی حصہ لیتی تھیں۔ والد مرحوم مولانا عبدالغنی عربی و فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں

بھی خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ اسی ماحول میں رہ کر اردو زبان سے ایک والہانہ عقیدت ہو گئی اور خاص طور پر برصغیر کے علماء کے بارے میں اس زبان میں کچھ لکھنا زندگی کا ایک ہدف بن گیا۔ امید ہے کہ کتابِ ہذا اس ہدف کے حصول کے ساتھ ساتھ علماء کرام کی علمی سرگرمیوں کے سلسلۃ الذہب کو اردو دان طبقے کے سامنے لانے میں ایک اہم کڑی ثابت ہو گی۔ "برصغیر میں اسلام" پروجیکٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد یوسف صدیق میرے فرزندِ عزیز ہیں جنہوں نے اس کتاب کی تحقیق، ایڈیٹنگ اور طباعت و اشاعت کا اہتمام کیا۔ اس پروجیکٹ کے تحت بنگال کے اسلامی کتبات کے متعلق چند انتہائی اہم کتابیں عنقریب شائع ہونے والی ہیں۔ اِن میں سے خاص اہمیت رکھنے والی چند درج ذیل ہیں:

1. *Historical and Cultural Aspects of the Islamic Inscriptions of Bengal: A Reflective Study of Some New Epigraphic Discoveries*, Dhaka: International Centre for Study of Bengal Art, 2009

2. محمد یوسف صدیق، "بنگال کے اسلامی کتبات اور ان کے تہذیبی اور ثقافتی اثرات"

امید ہے کہ برصغیر میں علماء کی شاندار علمی ثقافتی اور تہذیبی خدمات اجاگر کرنے کے سلسلے میں یہ کتابیں قارئین اور محققین کے لیے مددگار ثابت ہوں گی۔

H.E.C (ہائر ایجوکیشن کمیشن) پاکستان علمی تحقیقی کاموں میں جس قسم کی اعلیٰ ترین معاونت اور حوصلہ افزائی کر رہی ہے وہ قابلِ تحسین ہے اور اسی کی مرہون

منت پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف صدیق کی ''برصغیر میں اسلام'' نامی علمی واشاعتی منصوبہ ہے اور امید ہے کہ یہ منصوبہ علمی سرگرمیوں میں نمایاں خدمات سرانجام دے گا۔ بارگاہِ الٰہی میں ہماری یہی التجا ہے کہ اللہ اس کاوش کو کامیابی سے نوازے، آمین۔

فقیر بارگاہ صمدی
محمد مجیب الرحمن
پروفیسر وسابقہ صدر شعبہ عربی وعلوم اسلامیہ
راج شاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغاز

انسانی زندگی میں جسم و روح، علم و عمل اور نظریہ و کردار کی وحدت پیدا کرنا اسلام کا خاصہ ہے۔ اس مقصد کا حصول ہی انسانیت کی معراج قرار پاتا ہے۔ اسلام کا یہ زاویہ نگاہ صرف نظریاتی باتوں تک محدود نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کی روشن مثالیں اس بات کی گواہی کے طور پر تاریخ کا حصہ ہیں۔ اسلام کی یہ عملی تعلیمات اپنے ثمرات کے ساتھ صرف قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگیوں میں موجود نظر نہیں آتیں بلکہ بعد میں آنے والے کسی بھی عہد میں جس ہستی نے بھی علم و عمل اور نظریہ و کردار کی وحدت کے راستے کو اپنایا، اللہ تعالیٰ نے اس کو بے پناہ عزت سے بھی نوازا اور اپنی سنت کے مطابق اس کو آزمایا بھی لیکن ایک بات جو کتابِ ہذا کے حوالے سے اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام شخصیات کی زندگیوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اثر عطا کر دیا خواہ وہ ان کی علمی صلاحیتوں، تصنیفی کارناموں اور تبلیغی کاوشوں سے ظہور پذیر ہوا ہو یا پھر ان کی زندگی کی مثبت روش، جوش و جذبہ اور کردار کی پختگی سے دوسروں تک منتقل ہوا ہو۔

برصغیر کی جن عظیم ہستیوں نے اپنی جانفشانی، انتھک محنت، دردمند دل اور خونِ جگر سے اس علاقے میں اسلام کی آبیاری کا کام سرانجام دیا ان ہستیوں کا تذکرہ کرنا اور ان کی خدمات کو منظرِ عام پر لانا نہ صرف ان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے ضروری ہے بلکہ امت کی بگڑتی ہوئی صورتحال میں ایک صبحِ نو کی نوید کے لئے بھی لازمی

ہے یعنی اگر ہم اپنے اسلاف کے نمونے پر چلتے ہوئے اپنے اندر وہی ایمان، خلوص اور فکر وعمل کی وحدت پیدا کر لیں تو امت مسلمہ کے زوال کو عروج میں بدلنے میں دیر نہیں لگے گی۔ پیش آمدہ صفحات اسی قبیل سے تعلق رکھنے والی چند نابغہ روزگار شخصیات کی زندگیوں اور کارناموں پر مشتمل ہیں جن کے خلوصِ فکر وعمل اور پیہم جدوجہد نے اپنے اور اپنے بعد آنے والے دور کے لوگوں کے لئے بیش بہا علمی خزانہ اور خونِ جگر سے جلائے گئے پُر اثر زندگیوں کے چراغ جلتے ہوئے چھوڑے ہیں جو آج بھی دلوں کو منور کرتے ہیں۔

امام صاغانی لاہوری

پاکستان ان خوش نصیب ملکوں میں سے ہے جس کی تابناک تاریخ میں نسیمِ اسلام کے ہلکے ہلکے خوشگوار جھونکے چلتے رہتے ہیں۔اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی خوشبوئیں روح اور ذہن کو تازگی بخشتی ہیں اور اس کے آسمان میں علوم وفنون کے ان گنت درخشندہ ستارے آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں۔ان درخشندہ ستاروں میں اگر ہم کسی کو ادب ولغت کی اہم ترین شخصیت کی حیثیت سے پاتے ہیں اور ساتھ ہی شہرۂ آفاق محدّث اور ممتاز فقیہ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں تو وہ ابو الفضائل رضی الدین محمد بن حسن بن علی بن اسماعیل القرشی العدوی العمری الصاغانی لاہوری کی ذات ستودۂ صفات ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ برِّصغیر پاک وہند میں اشاعتِ حدیث کا آغاز دسویں صدی ہجری میں ہوا تھا مگر تاریخ ہمارے اس ظن وتخمین کا بڑی شدت سے انکار کرتی ہے اور صحت وتعیین یہ بتاتی ہے کہ حدیث کی تدریس وتعلیم کا کام ساتویں صدی ہجری ہی میں امام صاغانی کے مبارک ہاتھوں سے شروع ہو گیا تھا۔برِّصغیر کی تاریخ جب نئے سرے سے مرتب ہو گی تو آپ کا نامِ گرامی اس حوالے سے سرِ فہرست ہو گا۔

آپ لاہور شہر میں 10 صفر 577ھ کو پیدا ہوئے تھے[1]۔آپ کے اسلاف میں سے کسی شخص نے صاغانیاں کو خیر باد کہہ کر لاہور میں آ کر رہائش اختیار کر لی تھی، اس لئے آپ صاغانی کہلاتے ہیں۔ رہا صاغانیاں تو وہ ماوراء الہند (وسطی ایشیا) کے قریب ترمذ کی ایک عظیم ولایت (صوبہ) کا نام ہے۔

امام صاغانی کا نسب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے اس لئے آپ عمری بھی کہلاتے ہیں۔امام صاغانی نے خود اپنے اشعار میں اس نسبت کے متعلق کہا ہے:

فقلت یا دھری سالمنی مسالمة - فانی عمری ثم صاغانی

ترجمہ: ''میں نے کہا اے زمانے مجھ جیسے غریب پر کچھ تو رحم کھاؤ کیونکہ میں عمری ہوں اور صاغانی بھی۔''

امام صاغانی کی جائے پیدائش لاہور ہی ہے مگر ان کی نشو و نما غزنہ میں ہوئی۔وہ ایسی فضا میں پروان چڑھے جہاں ارد گرد ہر طرف علم و عرفان کا دور دورہ تھا۔ یہ غزنہ کے آخری سلطان ملک خسرو کا دور (1160ء-1186ء) تھا[2]۔امام صاغانی کے والد محمد بن حسن حیدر بن اسماعیل القرشی العدوی العمری مختلف علوم و فنون اور ادب و لغت کے جلیل القدر عالم تھے۔امام صاغانی نے ابتدائی تعلیم انہی سے پائی۔ان کے حالات و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ غزنہ میں اپنی تعلیم کے دوران وہ اتنی کثرت سے لاہور آیا کرتے تھے کہ لاہور میں ان کا مجموعی قیام پانچ سال سے زائد ہو گیا۔لاہور میں رہ کر ہی انہوں نے بعض اساتذہ سے احادیث پڑھیں۔اسی طرح اپنی رسمی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے والد بزرگوار سے درسِ حدیث لیا۔نیز اپنے والد بزرگوار کی صحبت و معیت میں رہ کر لغت میں پختگی اور اتقان پیدا کیا۔والد صاحب کا اپنے فرزند ارجمند کی علمی قابلیت کو جِلا دینے کا دستور یہ تھا کہ ان سے کوئی ادبی نکتہ یا علمی مسئلہ پوچھتے۔جب بچہ جواب دینے سے قاصر رہتا تو خود اس کے ہر ہر پہلو کی وضاحت و تشریح فرماتے اور بڑے سلیقہ سے اس کی پیچیدہ گتھیوں کو وا کرتے۔اس طرح عالم باپ نے اپنے لائق بیٹے میں بچپن ہی سے ادبی ذوق کو ابھارا اور اس کی خداداد ذہنی صلاحیت کو جِلا بخشی۔

بچپن ہی سے ان کے دل میں احادیث پر عبور حاصل کرنے کی ایک شدید اور نہ بجھنے والی پیاس موجزن تھی جو تحصیل علم حدیث سے فراغت کے بعد انہیں قانع و مطمئن ہو کر گھر بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ اسی امنگ اور پیاس سے سرشار ہو کر وہ تحصیلِ علم حدیث کی خاطر ہمیشہ رختِ سفر باندھے رہتے اور دور دراز کے سفر اختیار فرماتے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے زمانے کے کبار محدّثین کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ حدیث میں ان کے قابل ذکر شیوخ یہ ہیں:

1. ابو الفتوح نصر بن الفرج محمد بن علی البغدادی الحنبلی المتوفی 619ھ امام صاغانی نے ان سے مکہ معظمہ میں حدیث کی سماعت فرمائی تھی۔
2. ابو منصور بن الرزار سعید بن محمد البغدادی المتوفی 616ھ
3. قاضی سعد الدین الحسنا بادی
4. النظام محمد بن الحسن مرغینانی۔ امام صاغانی نے ان سے ہندوستان میں حدیث سنی تھی۔ (''تاج العروس''، مادہ صعن)

علم فقہ بھی انہوں نے اپنے زمانہ کے ماہر فقہاء سے حاصل کیا تھا جس میں شیخ الاسلام نظام الدین عمر بن علی المرغینانی کا نام قابل ذکر ہے۔

علم لغت تو آپ نے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اپنے والد صاحب سے حاصل کیا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے ذاتی سعی و کاوش سے لغت کی چند اہم کتابیں ازبر کر لیں۔ ان کے شاگردوں میں امام شرف الدّین الدمیاطی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے امام صاغانی اکثر و بیشتر اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے:

''تم سب ابو عبیدہ القاسم بن سلام کی تصنیف کردہ لغت ''غریب الحدیث'' کو ازبر کرو، جو اسے یاد کرے گا میں اسے ہزار اشرفیاں انعام میں دوں

گا کیونکہ میں نے اسے یاد کر کے ہزار اشرفیاں انعام میں حاصل کی تھیں اور میری ترغیب پر میرے دوستوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔"[3]

نجد کی سرزمین میں پانچ سال قیام کر کے امام صاغانی نے عربوں کی امثال اور لغت سیکھی۔ اس دوران میں انہوں نے مختلف علاقوں کی سیر کی اور متعدد دیہاتوں میں چل پھر کر لغت و اشتقاق، لسانی فصاحت اور سلاست میں ترقی فرماتے رہے حتی کہ اس فن میں کمال حاصل کیا۔

609ھ میں بمقام غزنہ جب امام صاغانی کے والد صاحب نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی تو وہ غزنہ کو خیر باد کہہ کر لاہور آ گئے۔ لاہور اُن دنوں علوم و فنون کا گہوارہ اور علماء و فضلاء کا مرکز تھا۔ اُن دنوں ہندوستان کے تختِ سلطنت پر قطب الدّین ایبک جلوہ افروز تھا جو کہ علوم و فنون کا سرپرست اور زبردست حامی تھا۔ چنانچہ اُس نے امام صاغانی کو منصب قضا پیش کیا مگر انہوں نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ ٹھکرانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ انتہا درجہ کے پرہیز گار، متقی اور شب زندہ دار انسان تھے۔ دنیاوی زندگی کی یہ چند روزہ عیش و آرائش ان کو پسند نہ تھی، اس پر وہ زہد و عبادت اور اللہ کی یاد کو ترجیح دیتے تھے۔ علاوہ بریں وہ منصبِ قضا کے عظیم بوجھ اور اس کی بھاری ذمہ داری کو اچھی طرح جانتے تھے۔ بعد ازاں امام صاغانی نے لاہور سے علی گڑھ کی طرف کوچ کیا ابھی چند ہی روز گزرے تھے کہ نائب مشرف بن کر پورے خلوص اور لگن سے اس خدمت کو انجام دینے لگے۔ ایک دن مشرف کے ساتھ دوران گفتگو ہنس پڑے جس سے مشرف کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے برو فروختہ ہو کر ان پر دوات دے ماری۔ اس پر امام صاغانی یہ کہتے ہوئے کہ "مجھے کیا پڑی کہ میں ان جاہلوں کا ساتھ

دوں" ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔ شدہ شدہ یہ خبر حاکم بلدیہ حسام الدین اوغلیک کو پہنچی تو اس نے فوراً بلا بھیجا اور اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت ان کے سپرد کی۔[4]

امام صاغانی علی گڑھ میں معمولی رقم پر مشقت آمیز مگر پُر اطمینان زندگی بسر کرتے رہے، پھر انہوں نے رضاکارانہ طور پر طلبہ کو درس دینا شروع کیا۔ بچپن ہی سے انہیں زیارت بیت اللہ اور فریضۂ حج ادا کرنے کا والہانہ شوق دامن گیر تھا۔ بارگاہ صمدی میں وہ اس کے لئے ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے چنانچہ اپنی کتاب "مناسک الحج" کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:

شوقی الی الکعبة الغراءقد زاد فاستحمل القلص الوخاه الزاد

ترجمہ: زیارت کعبۃ اللہ کا روز افزوں شوق میرے دل میں اس قدر پیچ و تاب کھاتا ہے کہ رخت سفر کے لئے صرف ایک مہانہ اونٹنی کی سواری کافی ہے۔

590ھ میں انہوں نے مہبط وحی اور حظیرۃُ القدس کی طرف کوچ کرنے کا مصمم ارادہ کر ہی لیا۔ مگر وہ جاتے تو کیسے جاتے، بالکل ہی غریب اور نادار تھے اپنے پاس نہ تو زادِ راہ تھا نہ سواری، حتی کہ پاؤں میں جوتا تک نہ تھا۔ چنانچہ بازار گئے، وہاں سے جوتا خریدا اور اسی غربت اور بے سرو سامانی کے عالم میں محض اللہ کے سہارے پاپیادہ ہی مکہ معظمہ کی طرف چل دیئے۔ ایک ہی منزل طے ہوئی تھی کہ تھک کر چور ہو گئے، طاقت جواب دے گئی۔ پھر یہ بھانپ گئے کہ یہ سفر ان کے بس کا روگ نہیں پھر بھی اس مردِ خدا کی ہمت اور عزم راسخ میں کوئی فرق نہ آیا۔ اللہ تعالی نے سواری کے اسباب فراہم کر کے آسانی پیدا کر دی، جس کا ذریعہ یوں بنا کہ حاکمِ بلدیہ کے بیٹے کو جب ان کے سفر حج کی اطلاع ملی تو وہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوا اور راستے میں ان سے جا ملا اور علی گڑھ واپس

جانے کے لئے انہیں مجبور کیا۔ وہ نہ مانے تو ان سے درخواست کی کہ اگر آپ کسی طرح نہیں مانتے تو ازراہ کرم یہ گھوڑا ہی اپنی سواری کے لئے قبول فرمالیں چنانچہ انہوں نے یہ قبول کر لیا اور اس پر سوار ہو کر اپنی مسافت طے کرتے ہوئے سندھ کے راستے مکہ مکرمہ جا پہنچے۔[5]

اس دیرینہ آرزو کے بر آنے اور فریضۂ حج سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے پانچ سال تک حجاز ہی میں قیام کیا۔ الشیخ ابو الفتوح مصری سے حدیث پڑھی نیز سنن ابی داؤد اور ابو الہیثم بن کلیب کی مسندِ کبیر کی بھی سماعت کی۔ پھر مدینہ منورہ پہنچے اور بئر بضاعۃ کو دیکھ کر اس کی پیمائش کا اندازہ لگایا جس کا ذکر حضرت ابو سعید خدریؓ کی حدیث میں آتا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں سنن ابی داؤد کے سماع کے وقت میں نے مکہ معظمہ میں یہ حدیث سنی تھی اس لئے جب 600ھ میں مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا تو اس باغ میں پہنچا جہاں بضاعۃ کا کنواں واقعہ تھا۔ میں نے اپنی دستار اتار کر منڈیر کی پیمائش کی تو اس وقت بھی اسے اسی طرح پایا جس طرح کہ امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔[6]

قیامِ حج کے دوران آپ زیادہ وقت بیت اللہ کے قرب وجوار میں گزارتے، اسی لئے وہ اپنی تصنیفات میں جا بجا اپنے آپ کو "الملتجی الی حرم اللہ" (حرم کا پناہ گزین) کہتے ہیں۔ حجاز میں قیام کے دوران آپ نے عربوں کے محاورات اور لغات سیکھیں اور بہت نزدیک سے ان چیزوں کا مطالعہ کیا جو اس سے قبل نہ کر سکتے تھے، مثلاً جمرۃ العقبۃ کے درے اور جبل حرا کے مابین "بنت الارنبہ" کو دیکھا، اس طرح مکہ کے راستے میں موضع قدید پر مرغ کے درخت کو دیکھا اور اس سے چقماق بھی حاصل

گیا۔ علاوہ ازیں اور بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کیا جن کا بڑا دلچسپ اور مفصل ذکر انہوں نے "العباب الزافر" میں کیا ہے۔

حجاز میں قیام کے دوران ہی وہ قاضی ابراہیم بن احمد بن سالم القرضی الیمنی کی شہرت سن کر ان کی خدمت میں پہنچے، جو شافعی مذہب کے ایک بلند پایہ محدّث اور وسیع المعلومات فقیہ تھے[7]۔ اسی طرح یمن کے مشہور محدث محمد بن احمد بن سالم القرضی الیمنی کی خدمت میں بھی پہنچے اور دونوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا۔[8]

605ھ میں امام صاغانی یمن سے کنیہ، ماہولہ وغیرہ کی بندرگاہوں سے ہوتے ہوئے حج کے موسم میں مناسکِ حج ادا کرنے کی خاطر مکہ مکرمہ پہنچے۔ حج کی ادائیگی کے بعد وہاں سے رختِ سفر باندھا اور 606ھ میں یمن کے راستے ہندوستان پہنچ گئے۔ حجاز سے واپسی کے وقت انہوں نے جدہ والوں کو عنبر مچھلی کی کھال کے جوتے پہنے ہوئے دیکھا جو بہت مضبوط اور پائیدار ہوتے ہیں تو اس کھال کا جوتا خرید لیا۔

حجاز سے واپسی کے بعد امام صاغانی اپنا بیشتر وقت سیر و سیاحت میں گزارنے لگے۔ انہوں نے سندھ سے ہوتے ہوئے سارے پنجاب کو چھان مارا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہندوؤں کی رسموں، اطوار و عادات، توہمات، تقاریب اور تہواروں کا بہت قریب سے بنظر غائر مطالعہ کیا۔ ان پیہم سفروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام صاغانی ہندوستان کے تمام شہروں، دیہاتوں، قصبوں، ندی نالوں، وہاں کے باشندوں اور تمام علاقہ جات کے چپہ چپہ کے حالات سے باخبر ہو گئے۔ ان وسیع معلومات پر انہیں بجا طور پر ناز تھا، چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے میں اس کی ساری حقیقتوں سے واقف ہوں اور اس کی اونچی چوٹیوں کو سر کرنے والا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے حالات سے متعلق جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ

غیر ملکی مؤرخین نے ہندوستان کے جن جن مقامات کو بیان کرتے ہوئے ٹھوکریں کھائی ہیں امام صاغانی نے اپنی کتابوں میں ان کی نشاندہی کر دی ہے، جنہیں ہم انشاء اللہ ان کی تالیفات کے ذکر میں ضبطِ تحریر میں لائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علم و دانش کے ہر بحر میں غوطہ زن ہو کر خود علم و دانش کا ایک ناپیدا کنار سمندر بن گئے تھے۔ اُن کی شہرت اور نیک نامی ہر سُو پھیل چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سفر و حضر ہر حالت میں اُن کے ہمراہ طلبہ کی ایک جماعت ہوتی، جو اُن سے فیض حاصل کرتی اور اپنی علمی پیاس بجھاتی؛ امام صاغانی کے درج ذیل شعر میں اسی طرف اشارہ ہے:

وکنت اسیر فی الآفاق من ماء ففرق الدھرا فراسی وارسانی

ترجمہ: ''ایک جماعت کو ساتھ لے کر میں شہروں کا چکر لگایا کرتا تھا اب زمانے نے میرے گھوڑوں کو منتشر کر دیا اور پھر مجھے مقیم بنا دیا۔''

اب کی بار اُنہوں نے ہندوستان میں تین سال قیام کیا اور پھر ادائے حج کی غرض سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے جو چلے تو عدن کی مسجد بصری میں جا کر دم لیا۔ آپ کے ساتھ بے شمار کتابیں اور خطیر رقم تھی جسے کسی متموّل شاگرد نے تحفۃً دیا تھا۔ وہ شاگرد آپ کے پاس عدن میں خطابی کی ''معالم السنن'' پڑھا کرتے تھے۔ خطابی کا کلام اور اُن کی یہ کتاب امام صاغانی کو بہت پسند تھی، چنانچہ وہ خود فرمایا کرتے تھے: ''بلا شبہ خطابی نے اس کتاب کے اندر تمام ضروریات کو جمع کر دیا ہے''۔ درس و تدریس سے فارغ ہو کر جو وقت بچتا اس میں کتب الصحاح نقل کرتے تھے۔ یہاں بھی اُن کے ہاں شاگردوں کا ہجوم رہتا تھا اور یہ لوگ قرأت حدیث و سماع میں ہر وقت سر گرم رہتے تھے۔

حواشی وحوالہ جات

1 - الجوہر المضیہ، ج1، ص201

2 - ملاحظہ ہو: تاریخ ثغر عدن، ج2، ص58؛ فوات الوفیات، ج1، ص133

3 - معجم الادباء، ج9، ص191

4 - نزھۃ الخواطر، ج7، ص137

5 - تاج العروس بذیل مادہ بضعہ

6 - فوائد الفوائد، ص102

7 - تاریخ اسلام، ذھبی ترجمہ صاغانی

8 - تاریخ ثغر عدن، ترجمہ محمد بن بطال الرکبی

علامہ نواب صدیق حسن خانؒ

نواب صدیق حسن خانؒ، قنوجی جیسی عظیم شخصیت کی حیات مستعار پر کچھ خامہ فرسائی کرنے سے پہلے نواب صاحب کے علمی شغف اور کتب سے والہانہ محبت کی ایک جھلک دکھانے کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذاتی کتب خانہ پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کسی بھی کتب خانہ میں موجود کتب وہ انمول دولت ہے جو انسان کو معلومات عامہ وخاصہ نیز مختلف علوم وفنون سے شناسا ہونے کا ایسا موقع دیتی ہیں جو لا محالہ دنیا کی کوئی دوسری چیز نہیں دیتی۔ بنا بریں دنیا میں کتب خانوں کی اہمیت اہل علم ودانش سے قطعاً مخفی نہیں۔ یہی ایک نرالی اور اچھوتی دنیا ہے جہاں کے مکینوں کو دغا بازی اور فریب کاری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس نرالی دنیا میں جو لوگ بسیرا کرتے ہیں وہ کبھی وحشت، تھکاوٹ اور اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے اور نہ ہی کبھی مادی خسارہ ونقصان کو پیش نگاہ رکھتے ہیں۔

امام بخاریؒ کے اُستاد زھریؒ کو کون نہیں جانتا۔ کتابوں کے اتنے شوقین اور دھنی تھے کہ اکثر وبیشتر اپنے ذاتی کتب خانہ میں بیٹھ کر ہی مطالعہ میں مصروف رہتے۔ ان کی بیوی کو ہمیشہ اس بات کی شکایت رہی، چنانچہ بیوی کا یہ قول بڑا مشہور ہے: واللہ اللہ ھذا الکتاب اَضرُّ علی من ثلاث ضرائر "یعنی بخدا میرے سرتاج کے کتب خانہ میں سجائی ہوئی کتابیں میری تین سوتنوں سے بھی کہیں بڑھ کر ہیں"۔ ھذا اصل امام زھریؒ کو اپنے کتب خانہ سے والہانہ محبت والفت تھی۔ اس مادی دنیا کے

وسیع و عریض خطوں و مملکتوں میں اپنے وقت کے کئی بڑے بڑے حکمران اور فرماں روا گزرے ہیں جنہوں نے قصرِ شاہی کی رنگ رلیوں اور عیش کوشی کو بڑی بے پروائی سے خیر باد کہہ کر کتب خانوں کی تنہائیوں اور خلوت گاہوں میں ہی اپنی زندگیوں کے اکثر و بیشتر لمحات گزار دیئے۔ جب وہ دور دراز ملکوں کے لئے رختِ سفر باندھتے تھے تو کتابوں کی کثیر تعداد بھی ان کے شریکِ سفر ہوتی تھی۔ ابھی ماضی قریب کی بات ہے حکومت برطانیہ کا وہ دور تھا جب کہ جنوبی ایشیا کے نابغۂ روزگار شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنا ذاتی کتب خانہ اپنے گھر کے قریب کی مسجد میں منتقل کر دیا اور قرآن و سنت کے مطالعہ جیسی عبادت میں یوں مستغرق ہوئے کہ پہلے پہل تو وقتاً فوقتاً گھر آجایا کرتے تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد گھر کی طرف اپنی آمدورفت کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا۔ اس طرح چالیس سال کی طویل مدت تک وہ اس مسجد میں ہی رہائش پذیر رہے۔ اس دوران میں انہوں نے قرآن و سنت پر مشتمل کئی کتابیں لکھ ڈالیں جن میں 'ترجمہ و تفسیرِ قرآن' سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر ہے۔ تاریخ اسلام آپ کے اس شاہکار پر رہتی دنیا تک ناز کرتی رہے گی۔ اس کے بعد پھر اسی کتب خانہ میں جہاں ایک طرف چالیس سال کی مدت اختتام پذیر ہوئی تو دوسری طرف آپ کا پیمانۂ حیات بھی لبریز ہو کر رہ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مسجد کے کتب خانہ ہی سے آپ کی میت قبرستان کی طرف منتقل کی گئی۔ سبحان اللہ! قرآن و سنت کی بے لوث خدمت کے ولولہ کی ایسی زندہ مثال تاریخ کے صفحات میں بھی خال خال ہی مل سکتی ہے۔

انہی ناپید مثالوں میں سے مشت از خروارے ایک مثال نواب صدیق حسن خان قنوجیؒ کی بھی ہے جن کی عظیم شخصیت اپنی حیات مستعار کے آخری دم تک ایسے ہی حالات سے گزر کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ نواب صدیق حسن خان اپنی تمام عمر

قرآن وسنت کی اشاعت، درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تبلیغ، دعوت وارشاد، تراجم، اداروں کی تنظیم و تشکیل، مدارس و مساجد کی تعمیر، علماء نوازی اور رفاہ عامہ جیسے اہم ترین فرائض کی بحسن وخوبی انجام دہی میں سرگرم اور مصروفِ عمل رہے۔ان گوناگوں مصروفیات سے اگر کچھ فرصت کے لمحات میسر ہوتے تو وہ اپنے ذاتی کتب خانہ کے ایک تنہا گوشے میں بیٹھ کر قرأت وکتابت میں ہمہ تن مشغول ہو جاتے۔

نواب صدیق حسن صاحب کا وسیع و عریض اور عظیم ترین کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کو منتقل ہو گیا۔ مولانا سلیمان ندوی نے اس بات کی تصدیق کی چنانچہ وہ اپنے شاہکار ''یادرفتگان'' میں رئیسۂ بھوپال سلطانہ سکندر جہاں بیگم کے تذکرہ کے ضمن میں بڑی وضاحت وصراحت کے ساتھ اس واقعہ کا اعتراف کرتے ہیں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ، ان کے شاگرد رشید امام ابن القیمؒ، علامہ شوکانیؒ، شیخ محمد بن عبدالوہاب النجدیؒ، حسین محسن الانصاری، شیخ الکل فی الکل سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کی دعوت وفکر کے اثرات نواب صدیق کی زندگی کے تابندہ کارناموں پر نہایت گہرے طور سے حاوی ومحیط ہیں۔نواب صاحب کی تصنیفات وتالیفات انہی بلند پایہ شیوخ واساتذہ کے نہج اور اسلوب وانداز پر ہیں۔ حکمت و دانش اور علوم وفنون پر مشتمل نواب صاحب کی اپنی تصنیفات وتالیفات ہی اس قدر زیادہ ہیں کہ ایک عظیم ترین کتب خانہ بن سکتی تھیں مگر آپ جیسا شہرۂ آفاق عالم اور بے مثال مصنف اپنی ہی تصنیف کردہ کتابوں پر مشتمل کتب خانہ پر قناعت کرتے ہوئے بھلا کب اطمینان وسکون کا سانس لے سکتا تھا۔ یہ تو ان کے لئے کسی طرح سے بھی ممکن نہ تھا۔وہ اپنے زمانہ کے سحر آفریں خطیب بھی تھے اور کہنہ مشق انشاء پرداز بھی، ایک طرف وہ مایہ ناز فقیہ تھے تو دوسری طرف ایک نامور متکلم، ایک بلند پایہ محدّث بھی تھے اور عالمی شہرت یافتہ مفسر

بھی، ایک کامیاب و مثالی حکمران بھی تھے اور صف اول کے قائد بھی، مجدّدِ ملت بھی تھے اور محقق بھی۔ الغرض رزم گاہ و بزم گاہ دونوں کے یکساں شہسوار، پیش رو اور نقیب تھے۔ فکر و نظر کے مسدود دروازوں کو آپ نے گویا قرآن و سنت کی کلید سے وا کرنے کی سعی و کاوش فرمائی۔ ہر چیز کو قرآن و سنت کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا۔ مرتے دم تک ان کی ساری دلچسپیوں اور عرق ریزیوں کے اصل محور قرآن و سنت ہی رہے ہیں۔ ریاست بھوپال کی باگ ڈور سنبھالنے سے قبل اس عارضی و بدلتی دنیا اور ابنائے دنیا سے بے نیازی ان کا طرۂ امتیاز رہا مگر بعد میں وہ فرمانروائے وقت اور حکمران ریاست بھی بنے۔

راج شاہی یونیورسٹی میں 27/26 سال تک سال آخر کے طلباء کو ''عون الباری'' پڑھاتے وقت مجھ پر یہ واضح ہوا کہ حضرت نواب صاحب جاہلی دواوین، عربی اسالیب و فصاحت و بلاغت اور صحف سماویہ وغیرہ پر کس قدر گرفت رکھتے تھے۔ جو کچھ کہتے، لکھتے اور لکھواتے تھے قرآن و سنت سے ضرور اس کی تائید و تصویب پیش کرتے تھے۔ علومِ منقولات کی ان دونوں کلیدوں اور مضبوط ستونوں پر اُن کی نظر بڑی گہری تھی۔ کئی زبانوں اور ادبیات پر انہیں کامل دسترس، عبور اور رسوخ حاصل تھا۔ ان دنوں برِّصغیر کی علمی دنیا پر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، ابن القیم الجوزیہ اور امام شوکانی رحمہم اللہ کے جو علمی و فکری اثرات پائے جاتے ہیں وہ بڑی حد تک نواب صاحب کی پیہم کاوشوں اور مساعی جمیلہ کے مرہون منت ہیں۔ صرف برِّصغیر ہی نہیں بلکہ پورے مشرق وسطیٰ کی علمی دنیا نواب صاحب کے علم و فضل اور عرفان و دانش کا لوہا مان چکی ہے۔

سرزمینِ مصر سے جب ان کے شاہکار زیور طباعت سے آراستہ ہوئے تو قرآن و سنت سے متعلق ان کا فکر و فن اس برِّصغیر کی جغرافیائی حدود کو عبور کرتے ہوئے عرب جامعات بلکہ چند مغربی ممالک کی جامعات تک بھی پہنچ گیا۔ دور دراز کے ان علمی

حلقوں تک نواب صاحب کے شاہکار اور ان کے فکر و فن کی رسائی میں ان کی انمول تحریروں کا غالب و نمایاں کردار پایا جاتا ہے۔ اُن کی پوری زندگی دینی ، دعوتی، ملی اور اصلاحی مصروفیات میں گزری۔ان مصروفیات کی موجودگی میں انتہائی اعلیٰ و ارفع علمی خدمات کی انجام دہی بادی النظر میں تو بالکل ہی ناممکن سی معلوم ہوتی ہے لیکن اس روئے زمین پر بعض ایسی شخصیتیں بھی قدم دھرتی ہیں جنہیں قسام اجل کی طرف سے ایک مخصوص فیضان مرحمت کیا جاتا ہے جس کی بدولت وہ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود انتہائی گراں قدر علمی و تحقیقی شاہکار ترکہ وورثہ کے طور پر اپنے پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔

نواب صدیق حسن خان ؒ بھی انہی چند گنے چنے مخصوص حضرات افاضل میں سے ہیں جن کو اللہ ربّ العزت کی طرف سے قرآن و سنت کی نمایاں خدمات کی توفیق ارزانی نصیب ہوئی۔ انیسویں صدی کے آخر تک آپ نے محض اللہ کی رضاجوئی کی خاطر نیز اہم عصری تقاضوں کے پیش نظر سینکڑوں اہم و انمول تراجم، تالیفات و تصنیفات، عرب و عجم کے ہم عصر اہلِ علم اور اپنی آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑی ہیں جو اُن کی علمی لیاقت و فوقیت، تبحرِ علمی، تحقیقی و تصنیفی صلاحیت، فکری رفعت، اجتہادی بصیرت اور قرآن و سنت پر آپ کی معلومات کی گہرائی کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کی تحریر و تالیف، استخراج اور استنباط و استدلال کا محور اور بنیادی مآخذ دراصل قرآن و سنت ہی ہیں۔ مختلف و متعدد موضوعات پر نظر ڈالتے ہوئے ایک طرف اگر اُن کی سینکڑوں تصانیف کی علمی فوقیت اور عظمت و وقار کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف قرآن و سنت کے وسیع و عریض میدان میں اُن کے علمی تبحر، مہارت و حذاقت اور بصیرت کی گہرائی کے ساتھ

ساتھ اُن کی اجتہادی و فقہی ژرف نگاہی اور سب سے بڑھ کر جداگانہ شناخت، منفرد و ممتاز حیثیت کی بھی مکمل نشاندہی ہو جاتی ہے۔

نواب صاحب کے دعوتی واصلاحی کارناموں کا معیار و پیمانہ بڑا ارفع و اعلیٰ ہے۔ اسلامی عقائد و اعمال کی تشریح و توضیح میں اُن کی خدمات بڑی نمایاں و منفرد ہیں۔ اسی طرح مبتدعانہ عقائد و اعمال کے بارے میں بھی آپ کا موقف نمایاں اور دوٹوک ہے۔ عربی و فارسی تصانیف کی طرح آپ کی اردو تصانیف کا علمی و ادبی مقام بھی بڑا اعلیٰ و ارفع ہے۔ زبان و ادب اور بیان و تعبیر کی پاکیزگی، سلاست، روانی و برجستگی، الفاظ، فقرات اور محاروں کے برمحل استعمال، سادگی، بے تکلفی و دلکشی، کمال فصاحت، زور بلاغت اور استدلال و استنباط کے اعتبار سے آپ کی انشاءاردوئے معلیٰ منہ بولتی تصویر ہے۔ خصوصاً ''تفسیر القرآن بلطائف البیان'' میں تو آپ نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ بہر کیف تفسیر ہذا اور نواب صاحب کی دیگر تفسیروں کی خصوصیات کے سلسلہ کا جائزہ لیتے ہوئے جب ہم قدیم مفسرین کی تفسیری توضیحات و تشریحات کی روشنی میں آپ کی تشریحات کا مطالعہ کرتے ہیں، خصوصًا قرآن کے الفاظ و معانی کو اجاگر کرنے اور اس کی اہم و مخصوص اصطلاحات کی تعبیر و تشریح میں آپ جو طرز و اسلوب اپناتے ہیں، تو ہمیں سلف کے تفسیری مذاہب سے آپ کی وابستگی، نیز آپ کی قرآنی بصیرت، وسعت مطالعہ، فکر و فن اور علم و عرفان کی گہرائی و گیرائی اور زبان دانی کے امتیازات کو اچھی طرح بھانپ لینے میں چنداں دشواری پیش نہیں آتی۔

دنیا کے نامور دانشوروں اور مصنّفوں کے کارناموں کا صحیح اندزہ عموماً بعد کے آنے والے ادوار میں ان کی افادیت و جامعیت سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ بعینہ یہی چیز ایک کامیاب قلم کار کو حیاتِ جاوید عطا کرتی ہے اور اس طرح سے آنے والی نسلوں کی

نظر میں اس کی عزت واحترام اور اس کی تعظیم وتوقیر کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔ بنا بریں اب اس چیز کی از بس ضرورت ہے کہ نواب صاحب کی تصانیف کا اس نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا جائے کہ ان میں وہ صلاحیت، قابلیت و خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے جو تشنگانِ علم و فضل کی سیرابی کا سامان فراہم کر سکے اور فتنوں کو للکار سکے اور منارۂ نور بن کر علم و آگہی اور تحقیق و تفحّص کی وسیع دنیا کو درخشندہ وتابناک کر سکے۔ مگر اس قسم کے تحلیل و تجزیہ کے لئے لامحالہ ایک دفتر کی ضرورت ہوتی ہے، کوئی مختصر سا مقالہ قطعاً اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ آپ کی ہر تصنیف اپنی جگہ پر ایک منفرد و مستقل مقالہ کی متقاضی ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں اب صرف آپ کی تصانیف کے محض سرسری تعارف پر ہی اکتفاء کیا جارہا لیکن اس سرسری اور مختصر سے تعارف سے بھی ان کی قدر و قیمت اور جامعیت و معنویت کی ایک جھلک اِنشاءاللہ قارئین کے سامنے آ سکے گی۔

لطائف البیان کی طرح جنوبی ایشیاء میں اردو دان طبقے کے لئے اتنی ضخیم تفسیر اس دور میں شاید ہی کسی اور نے قلم بند کی ہو۔ علاوہ ازیں فن تفسیر میں طبع آزمائی کرتے ہوئے نواب صاحب نے اور بھی چند شاہکار کتابیں تصنیف کیں۔ ''فتح البیان فی مقاصد القرآن'' اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ احادیثِ صحیحہ کی شروحات لکھنے میں جہاں آپ نے ''بلوغ المرام'' کی ضخیم اور محقق عربی شرح ''فتح العلام'' لکھ کر شائع کی وہاں فارسی میں بھی ''مسک الختام'' کے نام سے اس کی ایک ضخیم ترین اور مدلل شرح لکھ ڈالی۔ صحاح ستہ کے کوائف واحوال پر بھی آپ نے ایک کتاب لکھی۔

نواب صاحب کی اکثر وبیشتر عربی تصنیفات عرب ممالک یعنی شرق اوسط سے طبع ہو کر ہم تک پہنچی ہیں۔ اول الذکر یعنی ''فتح العلام شرح بلوغ المرام'' کا ایک اعلیٰ ایڈیشن دو جلدوں میں کویت کے مؤسسة الكتب الثقافية سے طبع ہو کر منظر

عام پر آیا ہے البتہ کتاب مذکور پر اس کے شارح و مصنف کی حیثیت سے حضرت العلام ابو الخیر نور الحسن خان کا نام درج ہے جو کہ نواب صاحب کے فرزندار جمند ہیں۔

سطور بالا میں ہم نے تفسیر القرآن و فقہ حدیث پر پانچ کتابوں کے نام درج کر دیئے ہیں اور ساتھ ہم نے ان پر بحث و تمحیص بھی کی ہے۔ اب ذیل میں کچھ اور بھی کتابوں کے نام درج کئے جاتے ہیں:

1. فتح العلام شرح بلوغ المرام بزبان عربی دو جلدوں میں ہے۔ اس کے مجموعی صفحات 461 ہیں۔
2. الروض البسام من ترجمة بلوغ المرام (یہ بھی عربی زبان میں ہے)، تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔
3. السراج الوهاج من كشف مطالب صحيح مسلم ابن حجاج بزبان عربی دو جلدوں میں ہے، مجموعی صفحات کی تعداد 1409 ہے۔
4. توفيق الباری لترجمة الادب المفرد للبخاری، بزبان اردو، کل صفحات 138، علاوہ پیش لفظ و سر ورق وغیرہ۔
5. الحطة فی ذکر الصحاح الستة، بزبان عربی، صفحات 314، اس میں صرف احادیث کا متن دیا گیا ہے، اسناد کو حذف کر دیا گیا ہے۔
6. اربعون حديثا متواترة فی فضائل الحج و العمرة، نواب صاحب قنوجی بھوپالوی کی یہ بھی بہترین کتاب ہے۔
7. رحلة الصديق الى البيت العتيق، نواب صاحب کا سفر نامۂ حرمین شریفین ہے۔ 1285ھ میں آپ نے سفر حج کا عزم کیا تھا۔ تقریباً آٹھ

ماہ تک مقامات مقدسہ میں قیام کرتے ہوئے مناسک حج بھی بجالائے اور اسی دوران سنن دارمی وغیرہ کی نقل وتالیف بھی اختتام پذیر ہوئی۔

8. نیل الاماتی بشرح مختصر الشوکانی۔ عربی زبان میں ہے، اس کے اردو وفارسی ایڈیشن بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

9. ضوءالشمس من شرح حدیث بنی الاسلام علیٰ خمس، (اردو) کل صفحات 125۔

10. ازلة الحيرة عن معنى احاديث "لاعدوى ولا طيرة" (فارسی)۔

11. اطلاق الجلوس عن اسرار احاديث النفوس، (فارسی)۔

12. زيادة الايمان باعمال الجنان (اردو)، کل صفحات 152۔

13. لب الباب من طريق الجمع بين حديث تحريم اكل الميتة و حديث الانتفاع بالاهاب۔

14. مالا بد من الرجوع اليه فى الكلام على حديث "رفع عن امتى الخطاءوالنسيان و ما استكر هوا عليه"۔

15. كشف الكربة عن اهل الغربة، صفحات 52۔

16. ازالة الضير بتجديد القرون الثلاثة المشهود لهابالخير۔

17. بسط الغرش لا ستقراءالخصال الموجبة بظلال العرش۔

18. افادة الشيوخ بمقدار الناسخ و المنسوخ، اصول تفسیر کے بارے میں مختصر مگر مستند کتاب ہے۔

19. "اتحاف النبلاء" اس ضخیم کتاب میں ائمہ محدثین و فقہاء و مجتہدین کے حالات اور ان کی تصنیفات کا تذکرہ ہے۔

20. حجج الکرامۃ، فارسی زبان کی اس کتاب میں مسائل دینیہ کے علاوہ تاریخی پہلو بھی موجود ہیں۔

21. ظفر القاضی و ذخر المفتی، اس میں قاضیوں اور مفتیوں کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں۔ صفحات 164، مطبع شاہجہانی بھوپال، 1295ھ۔ احادیث مبارکہ کی روشنی میں قاضیوں اور مفتیوں کے فتاوی صادر کرنے سے متعلق احادیث جمع کر دی گئی ہیں۔ قضاء اور افتاء کی تمام شرائط کا بسط و تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

22. احادیث نبویہ کی روشنی میں "وصیت" پر بھی نواب صاحب کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ عنوان تھا "المقالات الفصیحۃ فی الوصیۃ والنصیحۃ" بھوپال کی رئیسہ عالیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تقریباً 1270ھ میں یہ کتاب قلم بند کی تھی۔ 'وصیت' سے متعلق اس کتاب میں کافی معلومات واطلاعات دستیاب ہیں۔

ہم نے یہاں پر نواب صاحب بھوپالوی کی تصنیف کردہ صرف ان کتابوں کا ذکر کیا جو حدیث، فقہ حدیث واصولِ حدیث وغیرہ سے متعلق تھیں۔ علاوہ ازیں تفسیر، اصول تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ، تاریخ، عقائد، سلوک و تصوف وغیرہ اور دیگر علوم وفنون پر اُن کی اَن گنت کتابوں کا ذکر کرنے سے ہم نے اجتناب کیا ہے۔ اس اجتناب اور روگردانی سے ہمارا مقصد اطناب و طوالت سے پرہیز کرنا اور پھر ایجاز واختصار کو ملحوظ خاطر رکھنا ہے۔ لاہور پاکستان سے شائع شدہ ماہنامہ "محدث" کے صفحات میں ہمارے

ایک وفا شعار اور مخلص دوست پروفیسر غلام نبی عارف صاحب نے ایک قسط وار مضمون شائع کیا، اس کا عنوان ''نواب صدیق خان بھوپالوی کی عربی زبان میں دینی و ادبی خدمات'' ہے۔ اس کے علاوہ جناب عبدالرشید عراقی صاحب نے بھی بسط اور تفصیل کے ساتھ ان کے متعلق خامہ فرسائی کی ہے۔

نواب صدیق خان بھوپالوی ؒ نے بھی اپنے طور پر ایک خود نوشت سوانح حیات ترتیب دی تھی جس کا نام ''ابقاء المنن بالقاء المحن'' ہے۔ نواب صاحب موصوف کی یہ کتاب 1305ھ کے لگ بھگ ہندوستان سے طبع ہوئی تھی۔ گردش ایام کے ساتھ ساتھ یہ کتاب کم یاب اور پھر نایاب ہوگئی۔ ہمارے استاد محترم جناب مولانا عطاءاللہ حنیف بھوجیانی ؒ کی یہ دیرینہ آرزو تھی کہ اس کو دوبارہ زیور طبع سے آراستہ کیا جائے۔ چنانچہ سو سال کی پرانی اردو زبان کو جدید قالب میں ڈھال کر اس کی مکمل تسہیل، تنقیح اور ادارت کی ذمہ داری مولانا محمد خالد سیف، قاری نعیم الحق اور حافظ صلاح الدّین یوسف کو سونپی گئی۔ اس میں اور بھی اضافہ و نظر ثانی ہوئی، چنانچہ مولانا جعفر شاہ پھلواروی، مولانا محمد حسین بٹالوی اور علامہ محمد عبدالحیٔ الکتانی الجزائری رحمہم اللہ کی کتابوں اور مضامین سے بھی بہت سے اقتباسات نقل واخذ کئے گئے؛ اس طرح سے مزید اضافہ و تنقیحات کے ساتھ 1986ء میں نہایت دیدہ زیب سرورق کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔

عالیجاہ نواب صاحب موصوف نے اپنا یہ شاہکار بعض جلیل القدر و رفیع المرتبت اسلاف کے نقش قدم کی پیروی و متابعت کرتے ہوئے ترتیب دیا تھا۔ جیسا کہ کتاب ہذا کے آغاز میں مؤلف نے اس بات کی صراحت واضح الفاظ میں کردی ہے کہ اس کتاب کی خامہ فرسائی کرتے وقت خصوصی طور پر شیخ عبدالوہاب شعرانی ؒ کی کتاب

لطائف المنن والاخلاق فی بیان وجوب التحدث بنعمة الله علی الاطلاق ان کے پیش نظر رہی ہے کیونکہ نواب صاحب کو امام عبدالوہاب شعرانی کی تالیف مذکور، جس میں انہوں نے اپنے اوپر انعامات واحسانات باری تعالیٰ کا ذکر کیا ہے، بہت زیادہ بھایا کرتی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی تلخیص بھی انہوں نے اردو زبان میں ''فتح الخلاق للطائف المنن والاخلاق'' کے عنوان سے 1305ھ میں شائع کی تھی۔ بہرکیف یہ خودنوشت سوانح حیات (تسہیل شدہ) دانشورانِ ملت، راعی ورعایا، حاکم ومحکوم، اربابِ شوق وذوق اور اہلِ علم وآگہی غرض سب کے لئے یکساں طور پر نصیحت آموز اور فائدہ مند ہے۔ یہ کتاب ایک طرف اگر مفید نصیحتوں وعبرتوں کا مرقع ہے تو دوسری طرف حقائق وواقعات کا گلدستہ اور علم ودانش کا گنجینہ بھی ہے۔

والاجاہ نواب صاحب نے اپنی سوانح حیات لکھتے وقت ایک مفصل سیاحت نامہ بھی لکھ ڈالا ہے۔ پاکستان کے نامور شاعر و قلم کار جناب علیم ناصری نے اس فارسی سفر نامہ کو اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ اسی طرح مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی صاحب نے بھی اپنی انمول تحریروں میں نواب صاحب اور ان کے ذیشان خانوادہ کے متعلق نہایت مفید اور کارآمد معلومات فراہم کی ہیں۔

مزید برآں نواب صاحب کے ایک اور تربیت یافتہ رفیق کار مولانا ذوالفقار احمد صاحب بھوپالوی نے ''ذکر علماء النحو والادب'' کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس کتاب میں موصوف نے نواب صاحب کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز سے کیا ہے۔ اسی طرح مولانا محمد حسین بٹالویؒ اور علامہ محمد عبدالحئی الکتانی الجزائریؒ نے نواب صاحب پر بہت کچھ لکھا۔ اول الذکر تو جنوبی ایشیاء کے باسی ہیں مگر مؤخر الذکر شرق اوسط (عرب ممالک) کے ہیں اور ''التراتیب الاداریة'' و''فہرس الفہارس

والاثبات'' جیسی گراں مایہ کتب کے مصنف بھی ہیں۔ علامہ کتانی نے ''فہرس الفہارس'' میں نواب صاحب اور ان کی چند تالیفات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ساتھ ساتھ ان الزامات کا دفاع بھی کیا ہے جو کہ ایک مستشرق اور اس کے ہندی ہم نواؤں نے نواب صاحب پر عائد کئے تھے۔

نواب صاحب سے متعلق یہ سب چیزیں انمول و قیمتی دستاویزات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بلاشبہ یہ سب ان کی ہمہ جہت علمی خدمات کا ایک سرسری خاکہ ہیں اور بین دلیل بھی۔ سوانحی خاکہ کے علاوہ نواب صاحب نے خود اپنی حیات مستعار کے جستہ جستہ واقعات و دیگر مفید معلومات بھی اپنی مختلف کتابوں میں قلم بند کر دی ہیں۔ قارئین کرام کے استفادے و معلومات کے لئے ہم نے بعض کتابوں کے نام پہلے ہی درج کر دیے ہیں۔

علاوہ ازیں ماضی قریب میں سرزمین بھوپال کی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون رضیہ حامد نے نواب صدیق حسن خان صاحبؒ کی حیات و علمی خدمات پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ مولانا سید ابوالحسن ندوی کے پیش لفظ کے ساتھ کتابی شکل میں ''نواب صدیق حسن خان'' کے عنوان سے سرزمین بھوپال سے ہی اشاعت پذیر ہوا ہے۔

نواب صاحب کے فرزند ارجمند گرامی قدر ابو نصر سید محمد علی حسن خان طاہر (م نومبر 1936ء) نے اپنے بزرگوار والا جاہ نواب صدیق حسن خان کی سوانح عمری بنام ''مآثر صدیقی'' لکھی تھی جس کے چار حصے آج سے تقریباً نصف صدی قبل مطبع نول کشور لکھنؤ (انڈیا) سے شائع ہوئے تھے۔ اس کے بقیہ اجزاء کہاں تک احاطہ تحریر میں لائے گئے؟ پھر اشاعت پذیر کیوں نہیں ہوئے؟ اور اب وہ کہیں محفوظ بھی ہیں یا

نہیں؟ان سوالات کے معقول جوابات تو نواب صاحب مرحوم کے خاندان کے افراد ہی دے سکیں گے۔تاہم یہ بات اب بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ "مآثر صدیقی" ابھی تک مکمل طور پر زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی۔اس کی تائید مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے اُس ادارتی نوٹ سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے ماہنامہ "معارف" میں "تذکرہ طائر" یعنی سوانح حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خان طائر مرحوم کی اشاعت کے آغاز میں ذیل کے الفاظ و فقروں کے ساتھ تحریر فرمایا تھا: "نواب سید محمد علی مرحوم کی وفات سے جو صدمہ علم و فن کو پہنچا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ مرحوم نے اپنے والد ماجد کی جو مفصل سوانح عمری "مآثر صدیقی" کے نام سے لکھی ہے اس کا آخری حصہ ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد کے حال میں لکھا تھا۔اس حصے سے یہ خود نوشت سوانح عمری شائع کی جارہی ہے"۔[1]

اس 'تذکرہ طاہر' کی 6 قسطیں "معارف" جنوری تا جون 1937ء میں شائع ہوئی تھیں۔کیا ہی اچھا ہوتا اگر "تذکرہ طاہر" کے تمام اجزاء کی یکجا کتابی صورت میں اشاعت کا اہتمام بھی کیا جاتا اس طرح پھر سے اس ذی مرتبت خاندان کے واقعات و حالات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو جاتے مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکا۔

ع وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

اور یہ بھی حقیقت ہے! وَأَن لَّيْسَ لِلإِنسَانِ إِلاَّ مَا سَعَى۔ویسے تو کوئی ایک صدی قبل "ابقاء المنن بالقاء المحن" کے عنوان سے نواب صدیق خان صاحب نے نجی طور پر جو خود نوشت سوانح حیات ترتیب دی تھی وہ بھی اس "تذکرۂ طاہر" سے کس طرح راقم السطور ہے۔پچھلے صفحات میں کتاب مذکور "ابقاء المنن بالقاء المحن" پر پوری تحقیق و تجزیہ کرتے ہوئے میں نے بالتفصیل روشنی ڈالی ہے۔اور واضح الفاظ میں

یہ بھی بتادیا ہے کہ کتاب بذاتہ صرف مفید مواعظ و نصائح کا خزینہ ہے بلکہ نواب صاحب کے گوہر بار قلم سے انمول حقائق و معارف اور عبرتوں کا مرقع بھی ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے 1350ھ میں مطبع شاہجہانی بھوپال سے اردو زبان میں چھپی تھی۔ صفحات کی تعداد 150 تھی۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک اور محقق قلم کار جناب مولانا محمد لطیف ملک نے بھی بڑی تندہی، کدو کاوش اور جدوجہد سے نواب صدیق حسن خان پر پنجاب یونیورسٹی سے اعلیٰ ترین ڈگری کے حصول کی خاطر ایک پُراز معلومات مقالہ قلم بند کیا۔ الحمد للہ! ان کی کوشش بار آور اور کار آمد ثابت ہوئی اور وہ اپنی مطلوبہ ڈگری سے ہمکنار بھی ہوئے۔ ان کے مقالہ مذکورہ کا عنوان تھا ''نواب صدیق حسن خان کی تعلیمی فکر''۔

نئی دہلی سے شائع شدہ ہفت روزہ جریدہ ''ترجمان'' کے متعدد شماروں کے صفحات میں بھی نواب صاحب سے متعلق ایک مسلسل و پُر مغز مضمون شائع ہوتا رہا۔ غالباً اس سلسلہ وار مضمون کی اشاعت 1993ء کے اواخر میں شروع ہو کر ایک مدت مدید تک جاری و ساری رہی۔ اس مضمون کا عنوان ''نواب صدیق حسن خان، ایک علمی و ادبی شخصیت'' تھا۔ مضمون ہذا کے قلم کار جناب مولانا شاہد اسلم قاسمی ہیں۔ موصوف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے منسلک تھے۔ جناب شاہد اسلم قاسمی نے اس مضمون کی تکمیل میں بڑی عرق ریزی اور دقّتِ نگاہ سے کام لیا ہے۔

نواب صاحب کی پُر از واقعات حیات مستعار کے مختلف پہلوؤں پر مشرقی و مغربی ممالک کے گوشے گوشے میں کتنے ہی علماء، فضلاء، طلباء اور دانشوروں نے ماضی قریب و بعید میں تحقیقی مقالات و مضامین سپرد قلم کئے ہیں۔ ان کے ہمہ جہت، نوع

بنوع اور مختلف کارناموں و علمی خدمات کو اجاگر کرتے ہوئے نہ جانے کتنے مقالات(Thesis) مرتب کئے گئے اور آئندہ چل کر بھی کئے جائیں گے۔

ایک عظیم خوشخبری یہ بھی ہے کہ مذکورہ بالا عظیم المرتبت دانشوروں کی طرح نواب صاحب پر جس طرح سید حامد علی وجدی الحسینی نے بڑی تفصیل سے خامہ فرسائی کی ہے بعینہ سرزمین ہند کے نامور مصنّف جناب ابوالحسن علی ندوی نے بھی سوانحی خاکوں پر مشتمل اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' کے صفحات میں نواب صاحب کا تذکرہ کیا ہے مگر حیف صد حیف کہ مؤخرالذکر نے جو کچھ تحریر کیا ہے تعصّب و غلو کی عینک لگا کر ہی کیا ہے۔ کاش کہ وہ اپنی خامہ فرسائی اور تحریر و تصنیف میں ذرا سا غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کر لیتے۔

سیدابوالحسن علی ندوی کی طرح کچھ اور لوگوں نے بھی نواب صاحب کی شخصیت کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ مدراس میں بعض علماء نے نواب صاحب کے بعض رسائل پر بے جا اعتراضات کرتے ہوئے ان کی تردید میں کتابیں شائع کیں۔ ایک صاحب نے 'رسالة احتویٰ علی مسئلة الاستویٰ' کا بھی رد لکھا۔ کسی نے ''اتحاف النبلاء'' پر بھی اعتراض کیا۔ مگر ان اعتراضات کے جوابات نواب صاحب کی بجائے ان کے معاصرین نے ہی دے دیئے۔ جوابات ماشاءاللہ بڑے تشفی بخش تھے۔ اسی طرح ایڈورڈ کارنیلس فنڈیک نے بھی ''اکتفاءالقنوع بما ھو مطبوع'' کے عنوان سے کتاب لکھ کر قاہرہ مصر سے شائع کی۔ اس کتاب میں بھی نواب صاحب کے خلاف جو کچھ لکھا گیا اس کا جواب ہمعصروں نے ہی دے دیا۔ یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ نواب صاحب کی تالیفات سرزمین حجاز، مصر اور ہند میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر گویا دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں۔ پھر عرب و عجم کے

اکابر علماء نے ان کا خوب مطالعہ بھی کیا مگر کرنل ایڈورڈ صاحب کو اس کی کوئی اطلاع نہیں ہوئی۔ بریں عقل دانش بباید گریست! دراصل کارنیلس ایڈورڈ کو عربی، فارسی اور اردو زبان میں تحریر شدہ نواب صاحب کی تصنیفات و تالیفات پر کماحقہ دسترس بمشکل ہی ہو سکی۔ غالباً اسی بناپر انہوں نے نواب صاحب کے خلاف نکتہ چینی کرنے کی بھرمار کر دی۔ اسی طرح مولوی محمد حسین اغلب موہانی جو کہ اخبار اودھ کے ایڈیٹر بھی تھے، نے ایک کتاب شائع کی۔ کتاب کا پورا نام ''اسلام اور مسلمان'' تھا، اس کتاب کے صفحہ 33 سے انہوں نے مسلمانوں کے اسباب ترقی و تنزلی کی داستان تحریر کرنا چاہی مگر انہوں نے اپنی ساری نکتہ چینیوں کا پہلا ہدف والا جاہ نواب صاحب کو ہی بنایا۔ علاوہ ازیں انہوں نے نواب صاحب کے ردّ میں کئی کتابچے مرتب کئے، جن میں والا جاہ موصوف کو غیر ذی علم ٹھہرانے کی کدوکاوش کی۔

اغلب موہانی کی دیکھا دیکھی مدراس میں بعض علماء نے بعض نواب صاحب کے رسائل پر اعتراضات کئے اور انہیں شائع بھی کر دیا۔ ایک اور صاحب نے رسالہ ''احتوی علی مسئلۃ الاستوی'' کی تردید میں بہت کچھ تحریر کیا مگر اس کا جواب الجواب لکھ کر فوراً ہی مولانا عبدالقادر صاحب اراکانی اور سید نظام الدین میلاد پوری نے زیور طبع سے آراستہ پیراستہ کر دیا۔

ایک دفعہ ایک صاحب نے لکھنؤ شہر میں نواب صاحب کی کتاب ''اتحاف النبلاء'' کے سنوات وفیات پر، جو کہ حاجی خلیفہ کے شاہکار ''کشف الظنون'' وغیرہ سے نقل شدہ تھے، عدم صحت کا اعتراض وارد کیا حالانکہ 'وفیات' کا اختلاف عہد قدیم کے علماء (سابقین اولین) کی کتابوں میں چلا آرہا ہے اور مؤرخین پر تصحیح نقل کے علاوہ کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس سلسلہ میں نواب صاحب خود یوں رقم طراز ہیں:

''بڑی دشواری و مشکل یہ ہے کہ میں دلیل کو مذہب کہتا ہوں اور لوگ مجھ پر اپنی تقلید اعمیٰ کی وجہ سے اعتراض کرنا شروع کر دیتے ہیں۔''

سطور بالا سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہم عصر مخالفین و معاندین نے نواب صاحب کو کبھی چین سے جینے کا موقع نہیں دیا۔ حتیٰ کہ ان پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ جن کتب قدیمہ کا صرف ایک ہی نسخہ باقی رہ گیا تھا ان کا نام، عنوان اور حجم وغیرہ کو مسخ اور ادل بدل کرتے ہوئے نواب صاحب نے اپنے ہی نام سے فخریہ القاب کے ساتھ زیورِ طبع سے آراستہ کر دیا۔

نواب صاحب کے خلاف درج بالا الزامات کے علاوہ اور بھی کئی الزامات لگائے گئے۔ ان پر کبھی تو امام محمد بن علی شوکانی ؒ کی تقلید کی تہمت لگائی گئی جو کہ اپنے زمانہ میں بلند پایہ محدّث، مفسّر اور صنعاء ویمن کے شہرۂ آفاق قاضی القضاۃ تھے۔ کبھی یہ بہتان طرازی کی گئی کہ یہ ائمہ اربعہ کے حق میں عموماً اور امام ابو حنیفہؒ کے حق میں خصوصاً بڑے ہی بے ادب و گستاخ واقع ہوئے ہیں حالانکہ نواب صاحب کا رسالہ ''جلب المنفعة ''اس کی تردید و تکذیب کے لئے کافی وشافی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نواب صاحب اپنی تصنیفات میں بعض مسئلوں میں حنفی مسلک کو ہرگز ترجیح نہ دیتے جیسا کہ ''مسک الختام'' اور'' عون الباری'' وغیرہ میں بعض مسائل میں مسلکِ ابو حنیفہؒ کو راجح قرار دیا ہے۔

ان دونوں اماموں (صنعانی و شوکانی رحمہا اللہ) نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو شرک و بدعات کی پلیدی سے بچانے اور ڈرانے کی خاطر جہاں ضخیم کتابیں لکھیں وہاں کتابچے و رسائل بھی لکھے۔ اس موضوع پر علامہ صنعانی ؒ کے رسالہ کا نام ''تطہیر

الاعتقاد عن ادران الالحاد'' ہے اور علامہ شوکانیؒ کے رسالہ کا عنوان ''شفاء الصدور بتحریم البناء علی القبور'' ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ شرک وبدعت کے انسداد کی غرض سے عرب ملکوں میں جس طرح شیخ محمد بن عبدالوہاب، علامہ صنعانی و شوکانی رحمہم اللہ جیسے ائمہ مجتہدین ومجددین نے اپنے زمانہ میں شاہکار تصنیفات ودیگر پیہم کاوشوں کے ذریعہ ملک وملت کی اصلاح وتجدید کی ہے، اسی طرح جنوبی ایشیاء میں نواب صدیق حسن خان بھوپالویؒ نے بھی کی ہے۔

بلاشبہ عرب وعجم میں شاید کوئی ایسی جگہ ہو جہاں کے اہل علم کو نواب صاحب کی تالیفات نہ پہنچی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء، فضلاء ودانشورانِ ملت نے نواب صاحب کو اس صدی کا امام، مجتہد اور محدّث ومجدّد قرار دیا۔

نواب صدیق حسن خانؒ کئی زبانوں کے بلند پایہ عبقری ادیب وشاعر بھی تھے، چنانچہ اردو، عربی وفارسی میں وہ برجستہ اور فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ ان کا کلام ''گل رعنا'' کے نام سے دیوان کی صورت میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا جو بعد میں ''سخنِ توفیق'' کے عنوان سے بھی منظر عام پر آیا۔ نواب نے ان طبع زاد اشعار وقصائد کے ذریعہ جس طرح اپنے ہم عصر دانشوروں کی مدح سرائی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، عین اسی طرح دوسروں نے بھی دل کھول کر اُن کی تعریف وتوصیف کی ہے۔
مشت نمونہ از خروارے سطور ذیل میں ہم اپنے قارئین کرام کے لئے صرف اردو زبان وادب میں نواب صاحب کے چند اشعار وقصائد کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

بھوپال کی محترمہ ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ نے بھی، کہ جن کا ذکر خیر ہم نے پہلے بھی کیا ہے، اپنی شاہکار تصنیف میں نواب صدیق حسن خانؒ کے دیوان مذکور سے ذیل کے چند اردو اشعار منتخب کر کے شائع کئے ہیں:

فلک کی خیر ہو یارب کہ اس ستم گر نے
نگاہِ کرم سے پھر سوئے آسماں دیکھا
تیرے یکتائی کے دعوے میں نہیں دخل دلیل
حجت عقل سے ہے دور تو برہان سے الگ
کعبہ سے تابہ دیر کلیسا سے تاکنشت
پایا تجھی کو یاد جہاں تک نظر گئی
نہ بقاءان کو ہے توفیق نہ اس کو ہے قرار
یاں کے آرام پہ لعنت ہے اورآزادپہ تف

مذکورہ بالا اشعار میں نواب صاحب کے خیالات کی بلندی و پختگی، ان کے افکار کی پرواز اور معیار کی عظمت کے تحلیل و تجزیہ سے بخوبی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کا دل و دماغ کس قدر زرخیز اور بالاتر تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اہلِ حدیث ہونے پر انہیں بڑا فخر و ناز تھا چنانچہ اہلِ حدیث کے مسلک کی حمایت و حقانیت میں ان کے اردو، فارسی اشعار اس قدر زیادہ ہیں کہ اس مختصر تحریر میں نمونہ پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔

حواشی وحوالہ جات

1۔ ماہنامہ ''معارف''، اعظم گڑھ، جنوری 1937ء

مولانا محمد جوناگڑھی دہلویؒ

حضرت مولانا محمد جوناگڑھی دہلویؒ متحدہ ہندوستان کے جلیل القدر عالم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات میں بہت سی خوبیاں جمع فرمادی تھیں۔ وہ خطیب بھی تھے اور مناظر بھی، مصنّف بھی تھے اور مترجم بھی، معلّم بھی تھے اور محقق بھی، خوش گفتار بھی تھے اور عابد شب زندہ دار بھی۔ وہ کثیر المطالعہ بزرگ تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ ان کا اندازِ خطابت اور اسلوبِ تقریر نہایت پرتاثیر تھا اور وہ بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے تھے۔ ہر معاملے میں کتاب و سنت کے دائرے میں رہتے تھے اور اسی کو انہوں نے اپنا مقصدِ حیات قرار دے رکھا تھا۔ اظہارِ حق میں بے خوف اور اعلائے کلمۃ اللہ میں بے دھڑک!

اپنی زندگی میں حضرت مرحوم نے متعدد دفعہ غیر منقسم بنگال کی سرزمین پر قدم رنجہ فرمایا۔ ہائی کورٹ کلکتہ میں اپنے ایک مقدمے کی پیروی کی اور یہاں انہوں نے شادی بھی کی، مگر حیف ہے کہ ہنوز بنگالی کیا کسی دوسری زبان میں بھی مولانا مرحوم کی پہلودار شخصیت کے نصیحت آموز احوال، معلومات افزا اقوال اور ان کی دینی و ادبی خدمات کا کسی شخص نے جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی۔ اسی چیز نے خاکسار مولانا کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ لکھنے کے لیے آمادہ کیا۔ وماتوفیقی الا باللہ۔ [1]

ولادت اور نشوونما

مولانا جوناگڑھی کی پیدائش سابق صوبہ بمبئی اور موجودہ صوبہ گجرات میں ضلع کاٹھیاواڑ کے مشہور علاقہ جوناگڑھ میں ہوئی، جو متحدہ ہندوستان میں ایک اسلامی

ریاست کے نام سے معروف تھا۔ وہ جس خانوادے میں پیدا ہوئے اس کا نام ''میمن'' ہے۔ ذہانت و فراست، شجاعت و بسالت، امامت و قیادت، عزت و عظمت اور دولت و ثروت میں برِّصغیر کے اس خاندان نے بے حد شہرت پائی۔

مولانا کے والد محترم محمد ابراہیم مرحوم غلے کے تاجر تھے۔ والدہ کا نام ''بی بی حواء'' تھا۔ یہ دونوں میمن برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا محمد جونا گڑھی 1890ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے وطن مالوف میں جناب مولانا عبداللہ جونا گڑھی سے حاصل کی۔

مولانا کے والد ماجد محمد ابراہیم صاحب اپنی ابتدائی زندگی ہی سے کتاب و سنّت پر عمل کو بنیادی اہمیت دیتے تھے، اس لیے انہوں نے خود کو تقلید جامد کے بندھن سے آزاد کر کے ''محمدی'' وصف سے مزین کرنا پسند فرمایا تھا۔ ان کے خیال میں ہادیٔ عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر کسی امتی کی نجات ناممکن ہے، اس لیے کسی کی تقلید سے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، اس بنا پر انہیں اپنے احباب اور رشتہ داروں کی طرف سے غیر معمولی تکلیفیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ بی بی حواء کے بطن سے ان کے تین بیٹے پیدا ہوئے اور ایک بیٹی۔ ان کے اسمائے گرامی علی الترتیب یہ ہیں: اسماعیل، عائشہ خاتون، محمد اور عبدالسبحان۔

پہلی شادی اور بیوی کی وفات

مولانا محمد علی جونا گڑھی کی ابتدائی تعلیم بہت معمولی و محدود تھی، اسی محدود علم کو لے کر جب انہوں نے جوانی کے زینے پر قدم رکھا تو ان کے والد بزرگوار نے ان کی شادی ایک نیک سیرت لڑکی امینہ سے کر دی۔ چونکہ تعلم و تعلیم کا کوئی ارادہ نہ تھا اس

لیے ان کے والدِ محترم نے بیٹے کو عطر فروشی کی تجارت میں لگا دیا اور عاقل و فہیم بیٹے نے بڑی کامیابی سے تجارت کا یہ سلسلہ جاری رکھا۔

ادھر بی بی امینہ نے ایک بچے کو جنم دیا مگر افسوس کہ وہ بچہ جلد ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس رنج والم کی شب تار میں صبح امید آنے سے قبل ہی محترمہ امینہ دوسرے بچے کے وضع حمل کے موقعے پر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ ازدواجی زندگی میں مولانا کو اپنی شریکۂ حیات سے شدید محبت وانسیت تھی اس لئے ان کے اچانک انتقال سے سخت صدمے سے دوچار ہو کر ہر وقت کھوئے کھوئے رہتے، جس کی وجہ سے انہیں اہل خاندان کی جانب سے بے حد طنز و طعن کا سامنا کرنا پڑا، چنانچہ انہوں نے اپنے والدین کو بتلائے بغیر ترک وطن کر کے کہیں دوسری جگہ چلے جانے کا عزم کیا۔

سفرِ دہلی

اس دور میں شہر دہلی مسلم بیداری کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیم اور تہذیب و تمدّن کا عظیم مرکز تھا۔ مولانا وہاں پہنچے اور ان شہرۂ آفاق علماء کے سامنے زانوے تلمّذ طے کیا۔ اسی دور میں دہلی کی ہر مسجد تعلیم و تعلم اور علوم و معارف اسلامیہ کا ایک مرکز تھی۔

مولانا محمد علی جوناگڑھی 1913ء (یعنی بائیس سال کی عمر) میں اپنے مادر وطن کی محبت وکشش سے خود کو آزاد کر کے خفیہ طور پر دہلی کی جانب روانہ ہوئے تھے۔ ان کے والد بزرگوار محمد ابراہیم نے اپنے فرزند عزیز کو غائب پا کر اپنی دنیا کو تاریک تصور کیا۔ بسیارِ تلاش کے بعد جب بیٹے کا کھوج نہ لگا سکے تو بڑے کبیدۂ خاطر ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد ہونہار فرزند کی مفصل تحریر پہنچی تو اسے پڑھ کر اطمینان ہوا۔

مدرسہ امینیہ میں داخلہ

مولانا جوناگڑھی دہلی آکر ''مدرسہ امینیہ'' میں داخل ہوئے اور یک سوئی کے ساتھ علم حاصل کرنے لگے مگر چونکہ وہاں کے طریق تعلیم کے ہر گوشے میں تقلیدِ شخصی کا میلان پایا جاتا تھا اور قرآن و حدیث کی بجائے اقوال ائمہ کی روشنی میں مسائل پر غور کیا جاتا تھا، اس لیے وہ بہت جلد اس مدرسے نکل گئے۔

مدرسہ دارالکتاب والسنّۃ

اب کسی ایسے ادارے کی تلاش شروع کی جہاں کا نصاب تعلیم کسی خالص تقلیدی مسلک کا ترجمان نہ ہو، بلکہ جملہ مذاہب کی فقہ پر حاوی ہو اور خاص طور پر کتاب و سنت کی صحیح تعلیم اس کا لائحہ عمل ہو۔ خوش قسمتی سے جلد ہی اس قسم کے ادارے کا پتا چل گیا۔ وہ ادارہ صدر بازار دہلی میں اپنے وقت کا معروف ادارہ تھا، جس کا نام ''دارالکتاب والسنّۃ'' تھا۔ اس کے بانی حضرت مولانا عبدالوہاب دہلویؒ تھے۔ یہاں مختلف مذاہب کی فقہ، منطق، فلسفہ، اصول و تاریخ جیسے علوم کی تعلیم دی جاتی تھی، مگر سب سے زیادہ زور قرآن و سنت کی تعلیم پر تھا۔ مولانا محمد جوناگڑھی نے یہاں داخلہ لے کر بڑے شوق اور تن دہی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ وہ نہایت ذکی اور فہیم طالب علم تھے۔ اس خداداد صلاحیت سے فائدہ اٹھا کر یہاں کے مروجہ طریقِ تعلیم (درسِ نظامی) میں شریک ہوئے۔ اس زمانے میں پھاٹک حبش خاں دہلی میں مشہور محدّث مولانا عبدالرحیم غزنوی اور مولانا عبدالرشید کے تعلیمی ادارے کی بھی بڑی شہرت تھی۔ یہ دونوں حضرات جناب شیخ الکل حضرت میاں سیّد نذیر حسین محدّث

دہلوی (متوفی 13 اکتوبر 1902ء۔ 10 رجب 1320ھ) کے لائق و ارشد تلامذہ میں سے تھے، ان کے ادارے سے بھی مولانا جوناگڑھی نے بہت استفادہ کیا۔

کسی شخص کی ترقی اور کامیابی میں زمانے اور ماحول کا اگرچہ بڑا دخل ہوتا ہے، مگر اس کی انتھک کوشش، مسلسل جدوجہد، آگے بڑھنے کا شوق اور صبر واستقلال ہی دراصل اس کے لیے فوز وفلاح کا دروازہ کھولتے ہیں۔ یہ چند باتیں توحید وسنت کے علم بردار حضرت مولانا محمد جوناگڑھی کی ذات گرامی پر صادق آتی ہیں۔ تحصیل علم میں انہوں نے انتہائی جانفشانی اور محنت سے کام لیا، جس کی وجہ سے وہ اساتذہ کی نظر میں بڑے محبوب ہوئے۔ مذہبی علوم کی تحصیل و تحقیق میں انہوں نے جو غیر معمولی صلاحیت اور فہم وفراست کا ثبوت دیا، اس سے ان کے ہم عصر طلباء وعلماء انتہائی متعجب تھے۔ اس طرح ان کی علمیت اور ذکاوت کی شہرت بہت جلد پورے ملک میں پھیل گئی۔

دہلی میں قادیانیت کے خلاف جلسہ

1913ء میں وہ دہلی تشریف لائے تھے، اس وقت دہلی کے ارد گرد اور پورے پنجاب میں فتنۂ قادیانیت پھیل چکا تھا۔ اس کی تردید کے لیے مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں کی کوشش سے دہلی میں ایک عظیم الشّان اسلامی کانفرنس منعقد کی گئی۔ برِّصغیر کے تمام معروف علماء اور مسلم مندوبین اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس میں علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی تجویز کے مطابق صدارت کی کرسی پر حضرت مولانا ثناء اللہؒ امرتسری رونق افروز ہوئے۔ مولانا امرتسری اس عہد میں پوری طاقت کے ساتھ فتنۂ قادیانیت کے خلاف جدّوجہد کررہے تھے۔

وہ دور مولانا محمد جوناگڑھی کی تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا اور وہ علوم نقلیہ کی تحصیل میں سرگرم تھے۔ بعد ازاں علوم عقلیہ یعنی منطق، فلسفہ، اصولِ مناظرہ وغیرہ دہلی کے مشہور عالم مولانا محمد اسحاق دہلوی اور مولانا محمد ایوب پارچہ کی خدمت میں حاضر ہو کر پڑھے اور ان میں مہارت حاصل کی۔ یہ حضرات دہلی کی عظیم تاریخی درس گاہ دارالحدیث رحمانیہ میں بھی وقتاً فوقتاً تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔

دہلی میں مدرسہ محمدیہ کا قیام اور صحافتی سرگرمیاں

اختتام تعلیم کے بعد مولانا جوناگڑھی عملی زندگی میں داخل ہوئے اور اجمیری گیٹ میں اہل حدیث مسجد کو مذاکرۂ علمیہ کا مرکز اور مثالی تعلیم گاہ قرار دیا۔ اس ادارے کا نام ''مدرسۂ محمدیہ'' رکھا۔ اس میں دیگر اساتذہ کے ساتھ ساتھ مولانا خود بھی بیرونی طلبہ کی علمی تشنگی بجھانے کی سعی فرماتے۔ اٹھائیس سال کے طویل عرصے (یعنی ان کی وفات 1941ء) تک یہ مدرسہ حسن انتظام کے ساتھ قائم رہا۔ بعد کے زمانے میں ان کے شاگردِ رشید مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی اور مولانا عبدالرشید صاحبان نے اس مدرسے میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ اوّل الذکر نے اردو بازار دہلی کے تاریخی مدرسہ ''ریاض العلوم'' میں بھی ایک مدت تک تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔

صحافتی سرگرمیاں

اجمیری گیٹ میں قیام کے دوران مولانا محمد جوناگڑھی مرحوم نے تصنیف و تالیف کی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور صحافتی میدان میں اترے۔ چنانچہ تبلیغ اور اشاعت دین کے مقصد سے ایک ماہنامے ''گلدستۂ محمدیہ'' کا اجرا فرمایا، جس نے ایسی قبولیت حاصل کی کہ وہ رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا، 1921ء میں ''اخبارِ محمدی'' کے نام سے

پندرہ روزہ کی صورت میں شائع ہونے لگا۔ یہ اخبار ان کی ادارت اور حسن انتظام سے 1942ء تک یعنی پورے اکیس سال کی طویل مدت تک نہایت آب وتاب کے ساتھ جاری رہا۔ دینی حلقوں میں ان دنوں اس اخبار کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا مقصدِ وحید توحید وسنت کی بے لاگ تبلیغ واشاعت اور رُوبہ زوال اور محوِ خوابِ غفلت مسلم قوم کو ان کے روشن ماضی سے روشناس کرانا اور اسلامی تعلیم کو ان کے دلوں میں راسخ کرنا تھا، اس لیے اس کی افادیت کا دائرہ روز بروز بڑھتا چلا گیا۔

اوپر بتایا گیا ہے کہ اس اخبار کے اجراء کے دورِ ابتدا ہی سے مولانا جونا گڑھی اس کے ایڈیٹر رہے اور تادمِ واپسی یہ کام حسنِ نظم ونسق کے ساتھ جاری رکھا۔ 1941ء میں ان کی وفات کے بعد ان کے لائق شاگرد جناب مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی کی ادارت میں اخبار جاری رہا اور پھر بوجوہ بند ہو گیا۔ آئندہ چل کر مولانا سہسوانی کی ادارت میں "اخبار محمدی" کے دفتر ہی سے نام کی تبدیلی کے ساتھ ایک اور پرچہ جاری ہوا، مگر دونوں کے معیار اور مضامین میں کافی فرق تھا۔ درحقیقت ان دنوں "اخبار محمدی" کے ذریعے مسلمانوں کے غلط عقائد وخیالات کی اصلاح کی جاتی تھی اور غیر مسلموں کے مختلف النّوع اعتراضات کے جوابات بھی دیے جاتے تھے۔ 20، 21 سال کی لمبی مدت میں اس نے جس قدر دینِ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی خدمت انجام دی، اس کا اندازہ اور اس حقیقت کا اعتراف ہر اس شخص کو ہو گا جو اس کا قاری رہا ہو گا۔

اس اخبار کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ تحریک اہل حدیث کے خلاف مختلف اطراف و جوانب سے لگائے جانے والے اتہامات والزامات کی تردید کرتا اور مسلمانوں کو کتاب و سنت کی طرف راغب کرتا تھا۔ ہر قمری مہینے کی پندرہ تاریخ کو یہ اخبار شائع ہوتا تھا۔ ہر شمارے کے صفحات کی تعداد سولہ (16) ہوتی تھی۔

اختتامِ تعلیم کے بعد سے لے کر اخبار محمدی کے اجرا اور اس سے کچھ عرصہ بعد تک مولانا محمد جونا گڑھی اجمیری گیٹ ہی میں قیام پذیر رہے۔ یہیں ان کا قائم کردہ ''مدرسۂ محمدیہ'' اور ''اخبارِ محمدی'' کا صدر دفتر تھا۔

مدرسۂ رحمانیہ کے ساتھ مولانا کا تعلق

مولانا مرحوم کی نقل مکانی کا تذکرہ چھیڑنے سے قبل ہم پھر قارئین کرام کو مدرسۂ رحمانیہ کا ذکر سنانا چاہتے ہیں، کیونکہ مولانا کا اس سے گہرا تعلق تھا۔ ایک روایت کے مطابق مدرسۂ رحمانیہ کے پہلے مدرس اعلیٰ کے منصب پر مولانا محمد ابراہیم میر صاحب سیالکوٹی کو فائز کیا گیا تھا، لیکن حالات ایسے تھے کہ ان کے لیے سیالکوٹ سے باہر جا کر خدمت تدریس انجام دینا مشکل تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد معذرت کر کے وہ واپس سیالکوٹ چلے گئے تھے۔ البتہ سالانہ امتحانات کے ممتحن ابتدا ہی سے مولانا حافظ عبداللہ روپڑی کو مقرر کیا گیا تھا اور جب تک مدرسۂ رحمانیہ قائم رہا، سالانہ امتحانات کے لیے ممتحن وہی رہے۔

مدرسۂ رحمانیہ کے اساتذہ کی طویل فہرست میں ایک اور شخصیت کا نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہے، وہ ہیں شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی مبارک پوری صاحب ''مرعاۃ المفاتیح'' کے والدِ ماجد حضرت مولانا عبدالسلام مبارک پوری مؤلف ''سیرۃ البخاری''۔ موصوف اس وقت حدیث و تفسیر کے علاوہ ''شرح چغمنی'' بھی پڑھاتے تھے۔ ان کی شہادت کا قصہ نہایت ہی تکلیف دہ اور اندوہناک ہے۔

ایک روز مولانا عبدالسّلام مبارک پوری نے راج شاہی (بنگلہ دیش) کے ایک شاگرد شجاع الدّین باسودیب پوری سے فرمایا کہ میں نے پوری رات ''شرح چغمنی'' کا

مطالعہ کیا مگر کچھ خاص مطلب نہ سمجھ سکا، میرے خیال میں اس کا کلیہ ہی صحیح نہیں ہے۔ جواب میں شجاع الدین نے عرض کیا کہ میں نے محلہ دریبہ میں جاکر ایک عمدہ شرح حاصل کی ہے، مولانا نے منگوا کر اسے دیکھا تو واقعی عمدہ تھی اور اسی وقت حاصل کرنے کی غرض سے نکل پڑے کہ کہیں ختم نہ ہو جائے۔ آگے چل کر راستہ عبور کرتے ہوئے نئی سڑک گھنٹہ گھر کے پاس یکہ گاڑی کی زد میں آگئے اور پھر دریبہ ہسپتال میں دار آخرت کو روانہ ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہر سال مدرسۂ رحمانیہ کا سالانہ امتحان لینے کے لیے مولانا حافظ عبداللہ روپڑی اپنے بھتیجوں کے ہمراہ تشریف لایا کرتے تھے۔ مدرسۂ رحمانیہ کا ششماہی امتحان مدرسے کے اساتذہ ہی لیتے تھے اور ان کے ساتھ مولانا محمد علی جوناگڑھی بھی شرکت فرماتے تھے۔

مولانا جوناگڑھیؒ کے مزید خانگی احوال

مولانا جوناگڑھی کی غیر معمولی ذہانت، تیز فہمی، فراست اور نظم و نسق کے سلیقے کا مشاہدہ کر کے دہلی کے متعدد تاجروں اور رؤسا نے اپنی لڑکیوں کے لیے ان کو شادی کے پیغامات بھجوائے، لیکن انہوں نے اپنے استاذ مولانا عبدالوہاب کی سالی رابعہ خاتون کو ترجیح دی اور ان سے عقد کر لیا۔

شادی کے بعد رہائش کی ضرورت تھی۔ اب وہ عائلی زندگی میں داخل ہو چکے تھے۔ اور صاحب اولاد بھی ہو گئے تھے۔ اس وقت کی اولاد میں احمد (نابینا)، حسن، حسین، مریم، فاطمہ، زبیدہ اور ہاجرہ کے نام ملتے ہیں۔ اسی دوران آپؒ اپنے مادر وطن کی کشش سے جوناگڑھ تشریف لے گئے۔ وہاں اپنے خاندان کے اصرار پر اور مادر وطن

کے حق کی رعایت کرتے ہوئے دوسری شادی کی۔ اس خاتون کا نام حلیمہ تھا، مگر ان کو پکارنے کے وقت ''عائشہ دوم'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ عائشہ دوم کے بطن سے خدیجہ نام کی ایک لڑکی اور احمد نام کا ایک لڑکا پیدا ہوا۔ احمد کی ولادت کے وقت مولانا نے ایک بہت اچھی نظم لکھ کر شائع کی تھی۔ اس وقت وہ اپنے بچوں اور بچیوں کے ساتھ اجمیری گیٹ کے قریب ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد اس مکان میں چوری ہوگئی، اور گھر کا سارا اثاثہ، روپے، زیورات اور کپڑے وغیرہ چوری ہوگئے۔

اس تمام سامان کی چوری سے مولانا نہایت کبیدۂ خاطر ہوئے اور اپنے ذاتی مکان کی ضرورت کا احساس انہیں شدت کے ساتھ ہونے لگا۔ مکان کی تعمیر اور مشورے کے سلسلے میں اعانت کا ہاتھ سب سے زیادہ شیخ عطاءالرحمن صاحب، حاجی سیٹھ عبدالوہاب، حافظ حمید اللہ اور حاجی علی جان اور ان کے فرزند حاجی محمد صالح وغیرہ رئیسوں نے بڑھایا۔ آخرالذکر دو صاحبان کی رہائش گاہ نئی سڑک گھنٹہ گھر کے قریب تھی، مگر ان حضرات میں شیخ عطاءالرحمن کی امداد و اعانت سب سے بڑھ کر تھی۔ اتفاقِ رائے سے مکان کی تعمیر کے لیے مدرسۂ رحمانیہ کے قریب ایک وسیع خالی جگہ خریدی گئی۔ احباب و مخلصین کی لگاتار امداد و اعانت سے ایک کافی کشادہ اور بہترین مکان تعمیر ہو گیا۔

کچھ دنوں کے بعد اس مکان کے قریب ہی شیخ عطاءالرحمن کی آئس فیکٹری بنائی گئی اس کی دوسری جانب مدرسہ رحمانیہ کی عمارت تھی۔ اس دور میں مولانا جونا گڑھی کے مکان کی تعمیر پر کل بتیس صد روپے (3200) روپے خرچ ہوئے تھے۔ بالائی منزل پر مع اہل و عیال کے مولانا سکونت پذیر تھے اور نیچے کی منزل میں ایک طرف مطبع اور کتب خانہ تھا اور دوسری طرف پنجابی کرایہ دار رہتے تھے۔

کتابوں کی تصنیف و طباعت اور اُن کی فروخت سے حاصل شدہ منافع سے مولانا نہایت خوش تھے اور بڑے اچھے طریقے سے ان کی زندگی بسر ہوتی تھی۔ جدید عمارت سے متصل ''اخبارِ محمدی'' کا دفتر تھا اور مولانا بیشتر وقت وہیں صرف کرتے تھے۔ اخبار کے لیے مضمون نویسی کے ساتھ ساتھ دوسری کتابوں کی تسوید کا کام بھی وہیں انجام دیتے تھے۔

خطابت و مناظرہ

مولانا محمد جوناگڑھی کے زمانے کا برِّصغیر مختلف مذاہب کا گہوارہ تھا اور متعدد افکار و تصورات کے لوگ اس خطے میں آباد تھے، جو اپنے مذاہب و مسالک کی ترویج و اشاعت کے لیے ہر آن کوشاں رہتے تھے اور ان میں باہم بحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مسلمانوں کے مناظرے ہندوؤں کے فرقوں (آریہ سماج اور سناتن دھرم) سے بھی رہتے تھے اور عیسائیوں سے بھی۔ اسی طرح اہل حدیث، احناف اور شیعہ حضرات کے آپس کے اختلافی مسائل بھی بسا اوقات بحث و مناظرہ کا موضوع بن جاتے تھے۔ عیسائیوں اور ہندوؤں کے مناظراتی اکھاڑے بھی کہیں نہ کہیں جم جاتے تھے، اس سے تحقیق کے دروازے کھلتے اور سوچ بچار کی راہیں کشادہ ہوتی تھیں۔

حضرت مولانا محمد جوناگڑھی بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے اور تکمیل تعلیم کے بعد انہوں نے تقریر و تحریر اور مناظرات و مباحث کی وادی میں قدم رکھا، جس میں وہ اپنی افتادِ طبع کے سبب بے حد کامیاب رہے۔ وہ زمانہ مذہبی جلسوں کا تھا۔ مختلف مقامات پر تبلیغی جلسے منعقد کیے جاتے تھے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے زیر صدارت 1920ء میں جنوری کے پہلے ہفتے میں جو عظیم الشّان جلسہ منعقد ہوا تھا، مولانا جونا

گڑھی اس میں شامل تھے۔ اس جلسے کی مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا ثناءاللہ امرتسری تھے۔ اس میں برصغیر کے پانچ سو سے زائد علمائے کرام شریک ہوئے تھے۔

جمعہ کے دن مولانا، اجمیری گیٹ کی مسجد میں خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ان کی تقاریر و خطابات کا ذکر کرتے ہوئے "تذکرہ محمدی" میں مولانا محمد داؤد رازؒ رقم طراز ہیں:

"تصنیف و تالیف کے علاوہ میدان خطابت کے بھی وہ ایک نامی شہسوار تھے۔ قوت گویائی کا یہ حال تھا کہ گھنٹوں تقریر فرماتے اور تکان کا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ توحید اور سنت کے موضوع پر ان کے خطبات اس قدر دل نشیں ہوتے کہ سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے۔ سب سے پہلے انہوں نے آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس دہلی کے اجلاس میں کرسی پر کھڑے ہو کر تقریر فرمائی تھی۔ زورِ تقریر اور جوش جوانی کا یہ عالم تھا کہ ان کے وزن اور طاقت سے دو تین کرسیاں ٹوٹ گئیں۔ پھر تو میدان خطابت میں اس قدر مشہور ہوئے کہ ملک کے پورب پچھم جہاں کہیں بھی کوئی تبلیغی جلسہ ہوتا، حاضرین ان کی تشریف آوری کے متمنّی رہتے"۔

مولانا داؤد رازؒ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اسکے محبوب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود و سلام، ان کے مواعظ حسنہ کا زیور تھا۔ اسٹیج یا منبر پر تشریف لاتے ہی خطبہ مسنونہ کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد و ثنا کے لیے ایسے ایمان افروز اور دل نشین جملے زبان پر لاتے کہ سامعین ہمہ تن گوش بن جاتے۔ اس وقت خود مرحوم پر جو والہانہ کیفیت طاری ہوتی تھی اسے صفحہ قرطاس پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خود محبتِ الٰہی میں مدہوش ہو جاتے اور اس حالت بے خودی میں

ایسے ایسے بہترین الفاظ زبان سے نکالتے جن کو القائے ربانی ہی کہنا مناسب ہے۔"

وعظ و نصیحت کے لیے وہ قرب وجوار اور دور کی سبھی مجالس میں شرکت فرماتے۔ان کی جادو بیانی، شعلہ کلامی اور دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی پُر خلوص نصیحت کو سن کر سامعین پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ان کی باتیں سن کر کوئی بھی سامع متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ حق بات تو یہ ہے کہ ان کے دل نشیں انداز بیان سے سامعین مسحور ہو جاتے۔ قرآن و سنت کے دلکش بیانات، سیرت نبوی، تاریخِ اسلام، فرقہ بندی و مذہبی نزاعات کے انجام، سلف صالحین کے پُرکشش و پُر خلوص واقعات وغیرہ ان کی تقریروں کے عمومی مضامین تھے۔ان سب موضوعات کو حالاتِ حاضرہ کے ساتھ منطبق کرنے میں وہ مہارت تامہ رکھتے تھے۔

مذکورہ موضوعات ان کے زوردار خطبات کے درمیان اس طرح واضح ہو کر سامنے آتے کہ ہر سامع کے قلب ودماغ پر مرتسم ہو جاتے۔ان کی حکیمانہ اور دل موہ لینے والی نصیحتیں برصغیر سے شرک وبدعت اور تقلید شخصی کو مٹانے میں معاون ثابت ہوتیں۔ کتنے لوگوں نے ان پُرکشش پند و نصائح سے مسحور ہو کر شرک و بدعت اور تقلید شخصی کی زنجیروں سے خود کو آزاد کر لیا اور وہ توحید وسنت کے علم بردار بن گئے، ان کی تعداد کا شمار نہیں ہو سکتا۔

مرحوم کی تقاریر کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ دوران تقریر بے دین اور توحید سے عاری اہل بدعت کی کچھ بھی پروانہ کرتے،ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ اور جملوں کی شعلہ زنی مخالفین و ملحدین کے جسم وجان میں آگ لگا دیتی۔

مقدمۂ کلکتہ

ایک بار ایک جلسۂ عام میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ اپنی شعلہ بار تقریر سے پورے مجمعے کو مسحور کیے ہوئے تھے اور زبان سے مسلسل الفاظ اور جملوں کی بارش ہو رہی تھی۔ یہ تقریر ٹیٹا گڑھ کے قریب انگارہ نامی ایک گاؤں میں ہو رہی تھی۔ مخالفین کو یہ تقریر نہ بھائی اور حاضرین کی ایک مخالف جماعت نے کلکتہ جاکر توہین مذہب کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس مقدمے کی اس تقریر کے علاوہ ایک اہم وجہ "درۂ محمدی بنام سیف محمدی" کی تصنیف بھی تھی۔ در حقیقت ان کی اس تصنیف کے مضبوط اور ناقابل تردید دلائل نے مخالفین کے جذبات کو شدید زک پہنچائی تھی۔ مخالفین نے صرف مقدمہ دائر کرنے پر اکتفا نہیں کیا تھا، بلکہ دہلی کے اخبار محمدی کے آفس سے اس کتاب کی تمام کاپیوں کو غائب کر دینے کی سر توڑ کوشش کی تھی، مگر خوش قسمتی سے ان کی چند کاپیاں مخالفین کی دست درازی سے محفوظ رہ گئی تھیں، انھی نسخوں سے بعد کا ایڈیشن منظر عام پر آ سکا۔ 'درۂ محمدی' ایک اہم اور انمول کتاب تھی، مگر مخالفین سے اس کی مقبولیت برداشت نہ ہو سکی اور انہوں نے انگریزی حکومت کو مجبور کیا کہ اسے ضبط کر لے۔ اس وقت کتاب ضبط تو ضرور کر لی گئی مگر انگریزی حکومت کے خاتمے کے بعد ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر شائع ہوئی۔

ادھر کلکتہ ہائی کورٹ کے اس مقدمے کو خود سہروردی صاحب نے قبول کیا تھا۔ یہ مقدمہ بہت دنوں تک جاری رہا۔[2] اس میں مولانا کو غیر معمولی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ آخر کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ اس مقدمے کی وجہ سے طویل سفر کر کے بسا اوقات ان کے حقیقی دوست مولانا ابو الوفاء ثناءاللہ امر تسری (1287ھ-1367ھ مطابق 1878ء-1948ء) امر تسر سے کلکتہ تشریف

لاتے۔ مخالف ہوائیں جتنی ہی سخت ہوں، مصائب وآلام کے پہاڑ کتنے ہی سامنے آئیں اوراحوال وظروف ان کے خلاف کتنے ہی سازش کے جال بچھائیں، یہ حضرات کبھی بھی پیچھے ہٹنے والے نہ تھے، بلکہ وہ ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ سینہ تان کر ملک و ملت کی خدمت کرتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

بوتل بم سے قاتلانہ حملہ

مقدمے کے آخری مرحلے میں مولانا محمد جونا گڑھی کلکتہ کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ایک روز ہوٹل سے نکلتے وقت مخالف گروپ نے ان پر بوتل بم پھینکا، مشیت الٰہی زندہ رکھنے کو تھی، لہذا بال بال بچ گئے۔ مقدمے کا فیصلہ مولانا کے حق میں ہوا، وہاں شرپسندوں کے مکر سے محفوظ ہو کر پہلے عدالت کے جج کی گاڑی میں بیٹھ کر باعزت اسٹیشن پر پہنچے، بعدازاں لہریا سرائے دربھنگہ پہنچ کر مرحوم نے اطمینان کا سانس لیا، جہاں محترم ڈاکٹر محمد فرید نے ان کو مہمان بنایا اور انہوں نے مولانا کے اکرام میں ایک شان دار جلسے کا اہتمام کیا۔ اس جلسے میں شیر پنجاب اور فاتح قادیان علامہ ثناءاللہ امرتسری بھی تشریف فرما تھے۔وہ بھی مولانا جونا گڑھی کے مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے امرتسر سے کلکتہ تشریف لائے تھے۔درحقیقت ان دونوں کے مابین اس قدر قلبی لگاؤ تھا جو آج کے علما میں بالکل نظر نہیں آتا۔

تقلیدِ شخصی پر مولانا کا نظریہ

مولانا جونا گڑھی عموماً تقریر کے لیے کھڑے ہو کر تقلیدِ شخصی کے خلاف لب کشائی فرماتے۔ اس بارے میں جب قرآن کی تلاوت کرتے تو سامعین کو وہم تک نہ ہوتا کہ اس کا تقلید سے بھی کوئی تعلق ہے مگر جب آیت کی تفسیر و تشریح شروع کرتے

اور تقلید شخصی کے ساتھ مناسبت ظاہر فرماتے تو سامعین پر عیاں ہو جاتا کہ یقیناً یہ آیت تقلید شخصی کی مخالفت کے لیے نازل ہوئی ہے۔ کلکتہ سے جس روز لہریا سرائے پہنچے تو ڈاکٹر محمد فرید صاحب نے ایک خاص موضوع مقرر فرمادیا، جس کا بظاہر تقلید شخصی سے کوئی واسطہ نہ تھا، مگر جب اسی عنوان کے اندر سے تقلید کے بیان کو نہایت چابک دستی سے اس طرح نکال لائے، جس طرح شعرا حضرات ادنیٰ تشبیہ کو اپنے کلام میں لا کھڑا کرتے ہیں، تو ان کی فطانت و فراست کی تمام حضرات نے بے حد تعریف کی۔ دوران تقریر ان کے اور علامہ ثناءاللہ امر تسری کے دلائل اس قدر واضح اور مضبوط ہوتے کہ مخالفین کو مقابلے کی ہمت نہ ہوتی، بہت سے لوگ غلط رسوم اور بدعات سے توبہ کر کے قرآن و حدیث کے متبع بن جاتے۔

میرٹھ کا مناظرہ

دلی سے قریب میرٹھ شہر میں ''قراۃ فاتحہ خلف الامام'' کے موضوع پر ایک مجلس مناظرہ منعقد ہوئی، اس میں خاص مناظر کی حیثیت سے مولانا جونا گڑھی اور صدارت کے لیے علامہ ثناءاللہ امر تسری تشریف لائے۔ غالباً یہ مناظرہ 1940ء میں ہوا تھا۔ مولانا جونا گڑھی کی عادت یہ تھی کہ تقریر کے بعد عموماً جلسہ گاہ سے بلاتاخیر چلے آتے۔ میرٹھ کے جلسے سے بھی آگئے تھے، اختتام جلسہ کے بعد مخالفین نے کہا کہ مولانا نے موضوع اور اس کے دلائل تو ٹھیک پیش کیے ہیں مگر انہوں نے کہیں بھی حوالہ پیش نہیں کیا۔ علامہ ثناءاللہ امر تسری نے فوراً گاڑی بھیج کر مع ضروری کتابوں کے ان کو طلب کیا۔ انہوں نے واپس آکر تقریر میں پیش کردہ تمام دلائل کے مآخذ و مصادر جلد اور صفحے کھول کر دکھا دیئے۔ اس کے بعد اکثر مخالفین کی تردید اور ان کے ساتھ

مناظرے تحریری صورت میں کرتے۔ اس قسم کے جتنے مناظروں اور مباحثوں میں مولانا نے حصہ لیا ان کی تفصیل ''مناظرہ محمدی'' میں مذکور ہے۔ علاوہ ازیں راجکوٹ میں جو تاریخی مناظرہ ہوا تھا، اس کا مفصل بیان ''ظفر محمدی'' کے نام سے شائع ہوا۔

ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں میں مناظرہ

''مناظرہ محمدی'' کی تصنیف جس مناظرے کو سامنے رکھ کر کی گئی تھی وہ دراصل ہوشیار پور کے ایک مقلد عالم کے ساتھ ہونے والا بحث و مباحثہ تھا، جس کی تفصیل یہ ہے:

> ''ربیع الاوّل 1342ھ (اکتوبر 1923ء) کا واقعہ ہے کہ ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں ''اوان'' میں نظام الدّین نامی ایک صاحب رہتے تھے جو ملا ملتانی کے نام سے مشہور تھے اور ان کا گاؤں ''ٹانڈہ آڑماٹر'' سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ احناف کے علاوہ دوسرے مسالک کے حاملین کو وہ برداشت نہ کر پاتے تھے۔ انہیں وہ ناقابل بیان اور ناقابل سماع گالیاں دیتے۔ اہل حدیث پر ان کی گالیوں کی بارش سب سے زیادہ ہوتی۔

ان کی مسلسل گالیوں سے تنگ آکر ٹانڈہ بستی کے خان صاحب محمد حسن نامی ایک لنگی فروش نے نہایت سنجیدگی سے ان سے کہا کہ آپ کی بے شمار گالیاں سن کر میں سخت پریشان ہو گیا ہوں، لہذا آپ اپنے گروپ میں سے ایک ثالث مقرر کر کے ایک خاص جگہ متعین کریں، میں آپ کے مخالفین میں سے کسی عالم کو لاتا ہوں تاکہ حاضرین کے سامنے حق و ناحق کا فیصلہ ہو جائے۔

یہ کہہ کر خان صاحب نے مدرسہ اسلامیہ خان پور (ضلع ہوشیار پور) کے ناظم جناب عبدالغنی صاحب کو بلاتاخیر دہلی روانہ کر دیا۔ موصوف اجمیری گیٹ دہلی میں آئے اور مولانا جوناگڑھی کو اس مجلسِ مناظرہ میں تشریف لانے کی دعوت دی۔ مولانا "اخبار محمدی" کے کسی ضروری کام میں بے حد مشغول تھے لیکن عبدالغنی صاحب کے اصرار و الحاح کو ٹال نہ سکے اور جمعرات 4 ربیع الاوّل 1342ھ (15 اکتوبر 1923ء) کو ضلع ہوشیار پور کے گاؤں "اوان" کی طرف روانہ ہو گئے۔

مقررہ وقت پر پہنچتے ہی وہاں عوام کا ایک سیلاب اُمڈتا ہوا نظر آیا۔ دور دور سے لوگوں نے آکر اجلاس میں شرکت کی۔ "فتح کس کے پلڑے میں اور ہار کس کی تقدیر میں ہے" یہ جاننے کے لیے سبھی بے چینی کے ساتھ منتظر بیٹھے تھے، جن میں سرکاری عملہ بھی تھا۔ مناظرے کے مختلف موضوعات میں سے اصل موضوع تھا "غیر اللہ کے نام سے نذر و نیاز دینا اور منت ماننا جائز ہے یا ناجائز؟" یہ موضوع بھی تھا کہ "بڑے پیر شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام وظیفہ پڑھنا کیسا ہے؟"

ملا ملتانی کا غیظ و غضب اور ان کی اچھل کود اس روز دیکھنے کے لائق تھی۔ اپنے دوست واحباب، مریدین و متبعین کے جھنڈ میں محفوظ ہو کر پورے طمطراق سے کہا کہ ان سے میرا مناظرہ صرف میری شرطوں کو خاموشی کے ساتھ ان کا مان لینا ہے ساتھ ہی ملا ملتانی نے غصہ ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ غیر مقلد حضرات کا تو اہل سنت والجماعت میں شمار ہی نہیں ہوتا، کیونکہ یہ لوگ ائمہ کی تقلید نہیں کرتے۔ یہ حضرات جب تک اپنے کو اہل سنت والجماعت کے اندر ثابت نہ کر دیں تب تک آج کے موضوع پر بحث نہ ہو گی۔ اب مولانا جوناگڑھی نے اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت ثابت کرنے کے لیے

دلائل دینا شروع کیے۔ اس کے لیے مغرب کے بعد سے لے کر رات بارہ بجے تک مسلسل بحث ومباحثہ اور ردّ وابطال جاری رہا۔

مولانا نے ثابت کر دیا کہ حقیقی معنی میں اہل حدیث ہی اہل سنت والجماعت ہیں، کیونکہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش 80ھ میں ہوئی ہے اور دوسرے ائمۂ کرام آپ کے بعد ہوئے۔ یہ بالکل عیاں ہے کہ 80ھ سے قبل کسی امام کا وجود نہ تھا، اس لیے تقلید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے سنہرے دور گزر چکے تھے، اگر ائمہ کی تقلید کے بغیر اہل سنت ہونے کو تسلیم نہ کیا جائے تب تو صحابہ وتابعین کو بھی (نعوذ باللہ) اہل سنت سے خارج ماننا پڑے گا۔ خود ائمۂ اربعہ کسی کے مقلد نہ تھے۔ تحریک اہل حدیث کی غرض ہی یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریقے پر لوگوں کو دعوت دی جائے۔ اسی وجہ سے اہل حدیث کا دوسرا نام ''محمدی'' ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ جو لوگ مقلد نہیں وہی حقیقت میں اہل سنت ہیں، ورنہ ائمہ اربعہ کو بھی اہل سنت سے (العیاذ باللہ) خارج قرار دینا ہو گا۔ اہل سنت کی تعریف میں جب تقلید کا لفظ نہیں ہے تو پھر آج بھی اہل سنت وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو تقلید سے محفوظ ہیں۔

مولانا محمد جوناگڑھی نے عقلی ونقلی دلائل سے اتنی زور دار تقریر کی کہ بمع ثالث بلا تفریق تمام حاضرین نہایت متاثر ہوئے۔ مولانا کے ناقابل تردید دلائل کے سامنے حاضرین نے سر جھکا دیے۔ دوسری جانب ملا ملتانی کے بے اصل اور بے بنیاد دلائل لوگوں کے سامنے پھیپھسے معلوم ہوئے۔ مخالفین، ثالث اور تمام سامعین نے مولانا کی باتوں کی حقانیت کا اعتراف کیا۔ اس مناظرے میں مولانا نے اپنی مخالف

جماعت کو شکست فاش دے کر فتح حاصل کی اور ملا ملتانی بے چارگی کے عالم میں مجلس چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

جوناگڑھی کے معاصرین

مولانا محمد جوناگڑھی کے زمانے کا برِّصغیر علمی اعتبار سے نہایت پُر ثروت اور بے حد بارونق تھا۔ ان کے معاصرین کی فہرست بڑی وسیع ہے، جس میں اہل حدیث بھی شامل ہیں اور احناف بھی! اہل حدیث میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالقاسم بنارسی، مولانا محمد سورتی، علامہ خلیل عرب، مولانا ثناءاللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، سید محمد داؤد غزنوی، قاضی محمد سلیمان سلمان منصوری پوری، حاجی محمد صالح دہلوی، حافظ حمید اللہ دہلوی، شیخ عطاءالرحمن دہلوی، مولانا عبداللہ الکافی، مولانا عبداللہ الباقی، مولانا محمد اکرم خاں، حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا احمد اللہ پرتاپ گڑھی دہلوی، مولانا محمد یونس دہلوی جیسے بہت سے ممتاز علمائے کرام اس فہرست میں شامل ہیں، اور احناف میں سے حضرت مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی جیسی شہرہ آفاق شخصیات کے اسمائے گرامی سامنے آتے ہیں۔

یہ اس دور کے عظیم المرتبت لوگ تھے جو ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ بعض مسائل میں بے شک ان میں باہم علمی نوعیت کے اختلاف بھی تھے، جنہیں تعبیر کے اختلافات کہا جا سکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت عظیم المرتبت لوگ تھے اور نہایت شگفتہ طبع اور شائستہ مزاج .....!

تصنیف وتالیف

اسلام کی ابدی تعلیم سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے "اخبار محمدی" نے بے پناہ خدمت انجام دی۔ اسی طرح مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی اس مسلم قوم کو متحد کرنے میں مولانا جونا گڑھی کی تصانیف ہر پہلو سے بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو تک پہنچتی ہے۔ ہر کتاب اپنی جگہ ایک قیمتی جوہر ہے، جنہیں مسلم قوم کے ہر فرد کے پاس موجود رہنا چاہیے۔ان کتابوں کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے فاضل مصنف کی مدتِ حیات میں اکثر کتابیں کئی کئی مرتبہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں۔ان کی وفات کے بعد تقریباً نصف صدی میں پاک وہند اور بنگلہ دیش سے ان کتابوں کے متعدد ایڈیشن اور ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ گردشِ لیل ونہار کے باوجود ان کتابوں کی اہمیت جوں کی توں باقی ہے۔ مزید یہ کہ ان میں سے بعض کتابوں کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ بلاشبہ مولانا علیہ الرحمہ نے تصنیف وترجمہ کا کام انجام دے کر قرآن وسنت کی تبلیغ واشاعت کی اہم ذمہ داری نبھائی ہے۔

ان کی تصنیفی خدمات کے سلسلے میں "تذکرہ محمدی" میں حضرت مولانا داؤد رازؒ فرماتے ہیں:

> "اللہ تعالیٰ نے ان کو قلمی جہاد میں ایسا حوصلہ عطا فرمایا تھا کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی اشاعت کے سلسلے میں بہت سی کتابیں حوالۂ قلم فرمائیں اور ہر کتاب مضاف بنام پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرمائی، جیسے: ایمانِ محمدی، توحید محمدی، عقیدۂ محمدی، سیرت محمدی، صیام محمدی، زکوۃ محمدی، حج محمدی وغیرہ وغیرہ۔ یوں تو مصنف مرحوم کی تمام تصانیف نہایت قابل

قدر ہیں، مگر تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ ''تفسیر محمدی'' کے نام سے ان کی ایک گراں قدر خدمت دین ہے، جس کی وجہ سے اردو دان مسلمانوں کو تفسیر ابن کثیر جیسی ایمان افروز کتاب سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے۔ اسی طرح علامہ ابن قیمؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ''اعلام الموقعین'' کو اردو کا جامہ پہنا کر نوجوانانِ اسلام کے لیے دینی غور و فکر کا دروازہ کھول دیا۔''

ان کی تصانیف جہاں تبلیغ دین اور اشاعت مسلک اہل حدیث کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، وہاں اردو زبان کی خدمت و ترویج کے سلسلے میں بھی ان کتابوں کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ انتہائی صاف، شستہ اور ادیبانہ زبان میں انہوں نے احکامِ دین کی وضاحت فرمائی ہے۔

ترجمہ ابن کثیر بنام تفسیر محمدی

تفسیر ابن کثیر قرآن حکیم کی ایک نہایت اہم تفسیر ہے، مولانا جوناگڑھی نے عربی کی اس تفسیر کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے جو ان کا ایک لافانی شاہکار ہے۔ عربی اور اردو بولنے والے دونوں طبقوں کے اہل علم میں اس تفسیر نے بے حد مقبولیت حاصل کی ہے۔ اصل عربی کے مصنف علامہ ابن کثیر کا اسم گرامی حافظ عماد الدّین ابوالفدا عمر بن کثیر بصری قریشی دمشقی ہے، جو 701ھ (1302ء) میں پیدا ہوئے اور 774ھ (1373ء) میں وفات پائی۔

حافظ ابن کثیر کی یہ اہم اور صحیح ترین تفسیر چونکہ عربی زبان میں مقید تھی، اس لیے اردو دان طبقہ اس سے استفادہ نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مولانا جوناگڑھی کو اسے اردو میں منتقل کرنے کی توفیق بخشی۔ پوری ایک قوم یا مصنفین کی ایک جماعت کی ذمے داری کو انہوں نے تنہا چھ سالوں کی محنت شاقہ اور جہدِ

مسلسل سے پورا کر دیا۔ الحمد للہ علی ذالک۔ برصغیر پاک وہند کے اردو بولنے والے مسلمان ان کے اس احسان عظیم کا بدلہ کبھی ادا نہیں کر سکتے۔

اردو تفسیر ابن کثیر کی زبان اتنی سلیس، ستھری اور رواں ہے کہ ماہر ولائق قارئین حضرات بھی اسے پڑھتے ہوئے کسی کتاب کا ترجمہ تصور نہ کر سکیں گے۔ بلکہ اسے فن تفسیر کی ایک اصل کتاب اور جدید تالیف کی شکل میں دیکھا جائے گا۔

دنیا کی ہر زبان وادب کی اہم شاخ فن ترجمہ ہے۔ اردو زبان کی اس شاخ میں حضرت مولانا محمد جونا گڑھی ید طولی اور مہارت تامہ رکھتے تھے۔ وہ اس میدان کے کامیاب شہسوار تھے، حالانکہ اردو ان کی مادری زبان نہ تھی، بلکہ کاٹھیاواڑ جونا گڑھ کی گجراتی زبان ان کی مادری زبان تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ غیر مادری زبان میں مولانا نے صرف ترجمے کا کام ہی نہیں کیا بلکہ تصنیفی خدمت بھی کی ہے، اور بحث ومناظرہ میں بھی بے تکلفی سے اظہار مدعا کیا ہے۔ ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے خالص دینی اور شرعی مسائل کو ادیبانہ رنگ میں بیان کیا ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ دینیات کو ادب کا خوبصورت جامہ پہنا دیا ہے۔ ان کی تصنیفات میں مسائل بھی ہیں اور اردو ادب کی لطافت بھی موجود ہے۔ یہ ان کا بہت بڑا کمال ہے اور اس پہلو سے وہ منفرد شخصیت کے مالک تھے۔

اردو زبان و ادب میں اتنی زبردست مہارت رکھنے کے باوجود انہیں اپنی مادری زبان سے بھی بے حد پیار تھا۔ ان کی بیوی جن کا تعلق جونا گڑھ سے تھا، ان سے اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد اور وطن کے دوسرے لوگوں سے وہ گجراتی زبان ہی میں گفتگو کرتے تھے۔ مادری زبان اور جائے پیدائش کی فطری کشش اور دلی لگاؤ کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو جونا گڑھ کی طرف منسوب کر کے جونا گڑھی لکھنا پسند فرماتے تھے۔

ترجمہ اعلام الموقعین بنام دین محمدی

مجدد ملت حافظ ابن قیم الجوزیہؒ (691ھ-751ھ مطابق 1292ء-1350ء) کی ایک عظیم و شاہکار کتاب ''اعلام الموقعین'' ہے، جس کا مولانا جونا گڑھی نے اردو ترجمہ ''دین محمدی'' کے نام سے کیا۔ غالباً اس کے ترجمے کا کام 1934ء میں شروع ہوا تھا، جو 1938ء میں اختتام پذیر ہوا۔ پہلے یہ کتاب 'اخبارِ محمدی' کے صفحات پر منظر عام پر آتی رہی، پھر سات حصوں میں، جید برقی پریس دلی، میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی اور پندرہ روزہ اخبار محمدی کے دفتر سے شائع کی گئی۔ اس کے آخری حصے کا نام ''فتاویٰ محمدی'' ہے۔ دربار رسالت میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مواقع پر صحابہ کرامؓ نے بارہ سو(1200) سوالات کیے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوابات مرحمت فرمائے۔ ''فتاویٰ محمدی'' میں ان سوالوں اور جوابوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت قاری کو یہ تصور ہو گا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کی مجلس مبارک میں حاضر ہے۔ بارہ سو سوالات اور ان کے جوابات کے سوا بہت سی ضروری اور اہم باتوں کا ذکر اس میں آ گیا ہے، جن کا ہر مسلم مرد اور عورت کو علم ہونا چاہیے۔ اس ترجمے کو پڑھتے ہوئے یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ کسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ دین محمدی کو اردو میں لکھ کر مولانا جونا گڑھی نے دین کی بڑی خدمت کی ہے اور ملت اسلامیہ کا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کتاب میں تقلید یا ائمۂ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی بے دلیل اتباع، دینی معاملات میں قرآن و حدیث کو چھوڑ کر اپنی رائے وقیاس سے فیصلہ صادر کرنے کے بارے میں نہایت عمدہ اور بصیرت آمیز بحث کی گئی ہے، جو کسی دوسری جگہ اس انداز سے ضبط تحریر میں نہیں آئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوبات گرامی

مولانا جونا گڑھی کے اس اردو ترجمے کی اطلاع پا کر مولانا ابو الکلام آزاد (1888ء-1958ء) نہایت متاثر ہوئے تھے اور بڑی مسرت کا اظہار فرمایا تھا، اور بلا تاخیر سرور و خلوصِ قلب سے مولانا جونا گڑھی کی اس خدمت کا خطوط کے ذریعے خیر مقدم کیا اور مبارکباد پیش کی۔ یہ وہ خطوط ہیں جو تہنیت کے کلمات سے لبریز ہیں اور ترجمۂ اعلام الموقعین یعنی ''دین محمدی'' میں درج ہیں۔ قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے یہ دونوں مکتوبات گرامی یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

پہلا مکتوب حسب ذیل ہے۔

محبی فی اللہ- السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے حافظ ابن قیم کی ''اعلام الموقعین'' کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، مجھے اس خبر سے نہایت خوشی ہوئی۔ عرصہ ہوا میں نے بعض عزیزوں کو جو ترجمے کے کام سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس کام پر لگایا تھا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ الاسلام ابن قیم کی تصنیفات کو اردو میں منتقل کریں چنانچہ منتخب کتابوں میں اعلام بھی تھی، لیکن کتاب ضخیم ہے، اس لیے اس کی نوبت نہ آئی، مختصرات شائع ہو گئیں۔ اب آپ اس طرف متوجہ ہوئے ہیں تو میں کہوں گا، آپ نے ایک نہایت موزوں کتاب ترجمے کے لیے منتخب کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید توفیقِ کار عطا فرمائے۔

مباحثِ فقہ و حدیث میں متاخرین کا کافی ذخیرہ موجود ہے، لیکن اس سے بہتر اور اصلح کوئی کتاب نہیں۔ اسے اردو میں منتقل کر دینا اس گوشے کی تمام ضروریات کو بیک وقت پوری کر دینا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس کی ضرورت انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کے لیے ہے۔ اس طبقے میں بہت سے لوگ مذہبی ذوق سے آشنا ہو چکے ہیں، لیکن

صحیح مسلک کی خبر نہیں رکھتے اور عربی سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے براہِ راست مطالعہ نہیں کر سکتے۔ اگر اعلام اردو میں شائع ہو گئی تو ان کی فہم و بصیرت کے لیے کافی مواد مہیا ہو جائے گا۔ میں نہایت خوش ہوں گا، اگر اس ترجمے کی اشاعت میں آپ کو کچھ مدد دے سکوں۔

ابوالکلام کان اللہ لہ

از کلکتہ

اب حضرت مولانا آزاد کا دوسرا مکتوب ملاحظہ ہو جو انہوں نے "اعلام الموقعین" کا ترجمہ پڑھ کر فاضل مترجم کے نام ارسال فرمایا۔ یہ مکتوب 16 مارچ 1936ء کا ارسال فرمودہ ہے۔

محبی فی اللہ.... السلام علیکم

اعلام الموقعین کا ترجمہ دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی، مباحثِ فقہ و حدیث اور حکمتِ تشریع اسلامی میں متاخرین کی کوئی کتاب اس درجہ محققانہ اور نافع نہیں ہے، جس درجے کی یہ کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ اس مفید خدمت دینی پر متوجہ ہوئے۔ میں ان تمام لوگوں کو جو مذہبی معلومات کا شوق رکھتے ہیں اور اصل عربی کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے، مشورہ دوں گا کہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں، چونکہ اسلام کے اندرونی مذاہب و مشارب کی پیچیدگیوں سے عموماً مسلمان باخبر نہیں ہیں، اس لیے بسا اوقات ان کا مذہبی شغف غلط راہوں میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ان پر واضح کر دے گا کہ حکمت و دانش کی حقیقی راہ کن لوگوں کی راہ ہے؟ کتاب و سنت کی یا اصحاب جدل و خلاف کی؟ خود صاحب اعلام اپنے قصیدہ نونیہ میں کیا خوب فرماتے ہیں:

العلـــم قـــال الله وقـــال رســـوله
قـــال الصـــحابة هـــم اولـــو العرفـــان
مـــاالعلم نصـــبک للخـــلاف ســـفاهة
بـــين الرســـول و بـــين رأی فـــلان

ترجمہ: یعنی علم دین وہی ہے جو قرآن وحدیث میں ہے، جو معرفتِ خداوندی میں ڈوبے ہوئے فیضان صحبت رسول کے فیض یافتہ صحابہ کرام کی زبان سے ظاہر ہوا ہے، کسی کی رائے کو سنت وحدیث سے ٹکرانا، رائے کے غلبے کے لیے دلیل قائم کرنا اور جہالت کا ثبوت دیتے ہوئے رائے کے جھنڈے خلافِ حدیث بلند کرنے کا نام علم دین نہیں۔

ضرورت تھی کہ اس کتاب کا ترجمہ کتاب کی شکل میں شائع کیا جاتا۔ موجودہ صورت حال کا یہ نہایت افسوس ناک منظر ہے کہ اس طرح کی قیمتی اور ضروری خدمات پر اہل خیر واستطاعت کو توجہ نہیں۔ مجھے امید ہے کہ بہت جلد ایسے حالات فراہم ہو جائیں گے کہ آپ اس کو شائع کر سکیں۔ یہ بھی آپ نے خوب کیا کہ حافظ عماد الدین ابن کثیر کی تفسیر کا ترجمہ شائع کر دیا، متاخرین کے ذخیرۂ تفسیر میں یہ سب سے بہتر تفسیر ہے۔ امید ہے کہ اصحاب خیر واستطاعت اس کام میں بھی آپ کے مساعد ومددگار ہوں گے۔

ابوالکلام، کان اللہ لہ

کلکتہ، 1936/3/16ء

اس کتاب کی اہمیت، قدر وقیمت اور ضرورت کتنی زیادہ ہے، اس کو پوری طرح سمجھنا شاید اب مشکل نہیں ہوگا کیونکہ دونوں کتابوں (عربی اور اردو ترجمہ) کی

فضیلت و اہمیت کے بارے میں دنیائے اسلام کے رفیع المرتبت عالم امام الہند مولانا ابو الکلام آزادؒ کے یہ گرامی نامے اس سلسلے کی ایک عظیم شہادت ہیں۔ اردو میں ترجمے کے لیے اس عمدہ ترین کتاب کا انتخاب حقیقی معنی میں ہر اعتبار سے کامیاب رہا، اور یہ مولانا جوناگڑھیؒ کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔

جیسا کہ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے مکتوب سے واضح ہوتا ہے، انہوں نے علامہ ابن قیم کی کتاب "اعلام الموقعین" کو اردو میں منتقل کرنے کا حکم اپنے قریب کے کچھ لوگوں کو دیا تھا، وہ حضرات اس سے دلچسپی بھی رکھتے تھے، مگر اس عظیم و ضخیم کتاب کا ترجمہ کرنے کی وہ ہمت نہ کر سکے۔ چونکہ یہ فضیلت مولانا جوناگڑھی کے لیے مقدر تھی اس لیے دوسروں سے وہ کام نہ ہو سکا۔ البتہ جزوی طور پر مولانا آزاد کی ترغیب سے "اعلام الموقعین" کا ترجمہ شائع ہوا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام کے بنیادی مباحث کو اجاگر کرنے، سمجھنے، خالص سنت نبویہ کو بروئے کار لانے، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ عظام کے لائق اتباع کردار کو اختیار کرنے میں جس قدر یہ کتاب مشعل راہ بنے گی، اس دور کی تصنیف شدہ دوسری کتابوں سے یہ کام بہت ہی کم ممکن ہوگا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کے دور میں جو دینی فضا اور ماحول تھا کتاب میں اس کی بالکل صحیح طور سے عکاسی کی گئی ہے اور اسی میں اس کتاب کی ندرت اور کمال پنہاں ہے۔ بعد کے پُر فتن دور میں جن ایجادات اور خود ساختہ مسائل کو دینی مسائل کا نام دیا گیا، ان سے بالکل کنارہ کشی اختیار کی گئی ہے۔

کتاب کے مؤلف کا تعارف

''دین محمدی'' کے دیباچے میں خطیب الہند مولانا محمد جوناگڑھی نے ''اعلام الموقعین'' کے عظیم القدر مؤلف کا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے:

''علوم اسلامیہ کے بے پایاں میٹھے سمندر سے جس نے بھی ایک چلو پانی پی لیا وہ اس زمین کا مہتاب بن کر چمک اٹھا، لیکن جن خوش قسمت ہستیوں کو قدرت کے فیاض ہاتھوں نے اس آب کوثر کے چھلکتے ہوئے جام پر جام پلائے، ان کی نورانیت نے تو اندھیروں کو اجالوں میں بدل دیا۔ ان بزرگ ہستیوں میں ایک ممتاز ہستی ہمارے حضرت امام ابن قیم ؒ کی ہے۔ آپ 691ھ (1292ء) میں دنیا میں تشریف لائے، گو آپ کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن جن کی روحانیت کے رنگ میں آپ رنگے ہوئے تھے، وہ مجددِ دین حضرت امام ابن تیمیہ ؒ تھے۔ دنیا کا وہ کون سا علمی دریا ہے جس میں ہمارے ممدوح نے شناوری نہ کی ہو؟ وہ کون سا علمی شعبہ ہے جس میں آپ نے کمال حاصل نہ کیا ہو؟ آپ نے جہاں علومِ دینیہ میں اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا تھا، وہیں عمل صالحہ میں بھی ید طولیٰ حاصل کیے ہوئے تھے۔ دن رات ذکر اللہ اور تلاوت قرآن اور مطالعۂ حدیث اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے۔ بہت ہی منکسر المزاج، متواضع اور مرنجاں مرنج تھے۔ اخلاق حسنہ اور مخلوق کے ساتھ مروت میں اپنے زمانے میں بے نظیر تھے، زہد ورع، عبادت و ریاضت میں اس زمانے میں ان کا کوئی بھی ہمسر نہ تھا۔ صبح کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد نماز چاشت پڑھنے سے پہلے آپ مسجد سے کبھی نہ نکلے۔ یہ پورا وقت ذکر و فکر میں گزرتا۔ فرماتے ہیں یہ تو گویا میری غذا ہے، اسے اگر میں ترک کردوں تو میری طاقت ختم ہو جائے۔ آپ کے علمی شغف کا یہ حال تھا کہ آپ کے برابر کتب خانہ اس وقت کسی کے

پاس نہ تھا۔ آپ کی بہترین تصانیف آج تک محققین کے لیے شمع ہدایت کا کام دیتی ہیں۔ صحیح معنوں میں دنیا کے پردے پر اگر فقہ و حدیث کی کتابیں ہیں تو آپ کی تصنیفات ہیں۔ آپ کی تصانیف میں جو علمی جواہر ریزے موجود ہیں، ان میں جو لاثانی تحقیق اور تدقیق کار فرما ہے بلکہ ان میں جو نورانیت اور روحانیت، جو جذب اور کیف ہے، اس کا بہت کم حصہ دیگر مصنفین کو حاصل ہے۔ ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ آج ہر عالم ان کتابوں کا ایسا ہی محتاج ہے جیسے بھوکا کھانے کا اور پیاسا پانی کا۔ آپ برسوں تک اپنے استاد حضرت امام ابن تیمیہؒ کی صحبت میں رہے۔ آپ کو اپنے بزرگ استادؒ کے ساتھ بھی اور ان کے بعد بھی ہم عصر علمائے سوء نے سخت مخالفت کا نشانہ بنایا اور بے حد مصیبتیں پہنچائیں، لیکن یہ امام صاحب ہی کا دل گردہ تھا کہ پیشانی پر شکن تک نہ آنے دی اور حق مسائل کے پھیلانے میں دنیا کی دشمنی کی مطلقاً پروانہ کی۔ قرآن و حدیث کی جو باریکیاں خدائے تعالیٰ نے آپ کو سجھائی تھیں، آپ نے اس امانت خداوندی کے پہنچانے میں کبھی کمزوری سے کام نہ لیا۔ حق تو یہ ہے کہ عشقِ حدیث نے آپ کو اس منزل پر پہنچا دیا تھا کہ سوائے اشاعت حدیث کے آپ کے دل میں اور کوئی دھن ہی نہ تھی، مالی نقصانات، سب و شتم یہاں تک کہ جسمانی اور جانی نقصانات کی کبھی آپ نے پرواہ نہ کی۔ دنیا آپ کے قدموں پر گری لیکن آپ نے اسے ٹھکرا دیا۔ عزت، جاہ و منصب اور مال و دولت آپ کے سامنے پیش ہوئے لیکن آپ نے کبھی اس پر نظر نہ ڈالی۔ مصیبتوں کے گھٹا ٹوپ بادل گھر گھر کر آئے لیکن آپ کی مضبوط قوت ایمانی نے ان کا رخ ادھر سے ادھر پھیر دیا، سنت رسول اور حدیث کی اشاعت میں لوگوں کو اندھی تقلید کے پُر خطر گڑھے سے نکالنے میں وہ سختیاں سہیں کہ پتھر بھی ہوتا تو پانی ہو جاتا، لیکن کیا مجال کہ ہمارے ممدوح کا پیچھے نہ ہٹنے والا قدم ذرا سی دیر کے

لیے بھی رکا ہو۔ قید کیے گئے، رسوا کیے گئے، مصیبت میں گرفتار کیے گئے، آہ! اونٹ پر باندھ دیے گئے۔ بازار میں گھمائے جاتے ہیں۔ کوڑے کھا رہے ہیں اور زبان پر کلمۂ حق جاری ہے۔ اس جرات وہمت کے انسان چشم فلک نے کم دیکھے ہوں گے کہ حدیث پر عمل پیرا ہونے کے بعد ساری دنیا نے مخالفت کی، لیکن انہوں نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ گو تنہا ہیں لیکن اشاعت حق میں کوہِ ہمالیہ کی طرح اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں.... 3 رجب 751ھ (6 ستمبر 1350ء) بہ عمر ساٹھ سال وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ ورضی عنہ"

فقط محمد عفی عنہ۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ تاخیر ہی سے سہی، مگر حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کو جاننے اور آپ کی قدر و قیمت معلوم کرنے کی خواہش لوگوں کے دلوں میں بیدار ہوئی ہے۔ عرب دنیا کے علامہ رشید رضا، شیخ محمد ابوزید وعبدالعظیم شرف الدین وغیرہ محقق علماء نے سلطان ابن سعود کی مالی امداد واعانت سے بے حد کوشش کر کے حضرت امام کی کتابوں کو شائع کیا ہے۔ فاروق گنج لاہور کی الہلال بک ایجنسی نے بھی اپنی کوشش سے بہت سی کتابوں کو زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ لاہور میں قیام کے دوران میں نے بھی الہلال بک ایجنسی سے تقریباً یہ تمام کتابیں خریدیں۔ کلکتہ کے اخبار "عصر جدید" کے ایڈیٹر اور عربی اور اردو کے مشہور ادیب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی جن کتابوں کو اردو میں منتقل کیا ہے، ان میں سے کچھ کلکتہ سے اور کچھ الہلال بک ایجنسی لاہور سے شائع ہوئیں۔ بنگلہ زبان میں غالباً ہفت روزہ "عرفات" کے عربی اور اردو کے معروف ادیب اور متعدد کتابوں کے مصنف جناب عبدالرحمن بی، اے، بی، ٹی نے اس طرف سے پیش قدمی کی۔ انہوں نے "ہمارے نبی اور آپ کے

آورش'' کے نام سے امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی ''زاد المعاد'' کی تخلیص اور ترجمہ کر کے پہلی جلد شائع کی ہے۔ یہ کتاب اگر پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی تو بنگلہ ادب میں دین کے ایک نہایت گراں قدر باب کا اضافہ ہوتا۔

اس سلسلے میں اردو زبان میں مولانا جوناگڑھی یہ کی خدمت بھی انتہائی قابل ستائش ہے کہ انہوں نے امام ابن قیم کی ایک دوسری عظیم المرتبت تصنیف ''زادالمعاد'' کو تنہا بلاشرکت غیرے سات ضخیم جلدوں میں ترجمہ کر کے شائع فرمایا۔ یہ خدمت اس لیے بھی قابل ذکر ہے کہ اس کتاب میں اصول اسلام پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، علاوہ ازیں اس میں ایسے مباحث آ گئے ہیں جو اس سے قبل زیر بحث نہیں آئے تھے اور ان کے نکات اور رموز کو اس طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ اس سے پہلے وہاں تک ہماری رسائی نہیں تھی۔[3]

خطباتِ محمدی

اب ہم مولانا محمد علی جوناگڑھی کی ایک بہ درجہ غایت اہم کتاب ''خطباتِ محمدی'' کے بارے میں چند باتیں عرض کریں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری حیاتِ مبارکہ میں مختلف دینی مجالس و مجامع کو خطاب فرماتے ہوئے اپنی شیریں زبان میں جتنے خطبے دیے ہیں، مولانا نے ان سب کو مختلف عربی کتابوں کے صفحات سے نہایت محنت اور جاں فشانی کے ساتھ اخذ کر کے اس کتاب میں یک جا کر دیا ہے۔ پھر انہی نصوص کا ترجمہ کیا ہے، البتہ جمع و انتخاب اور تبصرہ و استنباط کے لحاظ سے یہ ایک مستقل کتاب ہے۔

جمعہ کے خطبے ہر زمانے میں جاری رہے ہیں، یہاں تک کہ موجودہ مادی دور میں بھی تمام ملت اسلامیہ میں بالاتفاق یہ سلسلہ جاری ہے۔ دنیا کے ہر اس ملک اور علاقے میں جہاں کم یا زیادہ جتنی بھی تعداد میں مسلمان موجود ہیں، خطباتِ جمعہ کا بہر صورت التزام کیا جاتا ہے۔ ماضی بعید میں بھی ان خطبوں نے مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں میں مشعلِ راہ کا کام دیا ہے۔ پورے ہفتے میں مشاغلِ زندگی کے دوران میں دلوں پر جو زنگ طاری ہو جاتا ہے، جمعہ کے خطبے اس کی تمام آلائشوں کو زائل کر کے ہمارے دلوں کو صاف شفاف کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ نیز آنے والے دنوں میں دینی کام کرنے کے لیے دلوں کو چست اور طاقتور بنا دیتے ہیں۔

زمانہ ماضی میں مختلف مواقع پر ان خطبوں سے زندگی کے ہر شعبے میں انسان نے اپنے لیے خاص تسلی، تعلیم اور ہمت حاصل کی ہے اور اس طرح بے شمار لوگ تقدس کا پیکر بن گئے ہیں اور ان کی زندگی کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے۔ لیکن جب ملتِ اسلامیہ کے اتحاد میں شگاف پڑ جاتا ہے اور شوکتِ اسلام رو بہ زوال ہو جاتی ہے تو چاروں طرف تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس وقت یہ امتِ مسلمہ، اللہ کی رحمت اور برکت سے محروم ہو کر ناکامی اور گمراہی کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ خطبے چونکہ عربی زبان میں ہیں، اس لیے بسا اوقات غیر عرب سامعین ان سے استفادہ نہیں کر سکتے، نہ ان کے جذبات میں کوئی تحریک پیدا ہو سکتی ہے، اس کی مثال تو ایسی ہو گی جیسے کسی قبرستان کے اندر یا کسی سوئی ہوئی بستی میں یہ خطبے دیے جا رہے ہوں، جہاں ان کے سننے اور ان سے مستفید ہونے کی ہرگز کوئی صورت نہیں ہے۔

امت مسلمہ کی اس حالتِ زار کے پیش نظر مولانا محمد جونا گڑھی جو برِ صغیر کے قادر الکلام خطیب بھی ہیں، نہایت افسردہ خاطر ہوئے، انہوں نے اس کے ازالے کے

لیے عزم مصمم کے ساتھ پیغمبرِ افضل و اعظم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان گیارہ سو خطبوں کو جو آپ نے اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں پیش فرمائے تھے، نہایت قابلیت کے ساتھ متعدد احادیث سے انتخاب فرما کر موٹی موٹی سات جلدوں میں شائع فرمایا۔ بایں طور مولانا جوناگڑھی کا یہ عظیم کارنامہ ہے۔ اس میں مسلسل ارقام کے ساتھ تقریباً پانچ سو عنوانات کے تحت انسانی زندگی میں پیش آمدہ روزمرہ کے مسائل و امور کا کامیاب حل بزبانِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح مولانا کی مدتوں کی محنت اور پیہم کوشش سے یہ ایک بے مثال کتاب بن گئی، جسے دل لگا کر پڑھتے ہی ہر قاری کا ایمان و عقیدہ خوف الٰہی سے لبریز ہو جاتا ہے اور فکر میں انقلاب رونما ہو جاتا ہے۔ خلوص و محبت کے ساتھ اس کو پڑھنے سے انسان دنیا سے بے رغبت، سنت رسول اللہ کا شیدائی اور روزمرہ زندگی کے معاملات میں حق گوئی و حق پرستی جیسی عظیم صفات سے متصف ہو جاتا ہے۔

مختلف مسائل کا مجموعہ

لوگوں سے میل جول، خرید و فروخت، رشتے داروں سے تعلقات، ہمسائیوں سے مراسم، ناپ تول وغیرہ تمام دینی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل ان خطبات میں بہ تفصیل جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو بے شمار مسائل کا بہترین مجموعہ ہے اور بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

زیر نظر کتاب کی اصلی عبارت یعنی عربی متن تو تبصرے سے بالاتر ہے، مگر اس کے ترجمے کی زبان اردو اس قدر سلیس، دلکش اور رواں ہے کہ قاری اسے پڑھ کر بے حد متاثر ہوتا ہے۔

مولانا جونا گڑھی خود ایک بے مثال مقرر اور صاف گو خطیب تھے۔ اللہ جلّ شانہ نے اپنے بے پایاں رحم وکرم سے خطابت کے جملہ اوصاف مولانا مرحوم کو عطا فرمائے تھے، یہی وجہ ہے کہ انتہائی سخت اور سنگ دل سامعین کی آنکھوں سے بھی ان کی جادو بیانی سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ مولانا ایک بااثر اور زور دار خطیب کی حیثیت سے ملک گیر شہرت کے مالک تھے اور اس بات کے آرزو مند بھی تھے کہ معاصر علما کو بھی ماہر مقرر و خطیب بنائیں۔ مولانا کی سات ضخیم جلدوں میں ''خطباتِ محمدی'' کے نام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبوں کی تدوین، اسی خواہش کی تکمیل کی عملی شکل تھی، یہ ان کی آخری تالیف بھی تھی۔ اس کتاب نے بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔

حاصل کلام یہ کہ ''خطباتِ محمدی'' ایک اہم اور روزانہ کام آنے والی بے مثال کتاب ہے۔ اس کے موضوعات و مضامین کی فہرست دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک مختصر مگر جامع اسلامی دائرۃُ المعارف ہے اور مختلف مسائل کا خوب صورت مجموعہ۔[4]

دیگر تراجمِ کتب

مولانا محمد جونا گڑھی نے ترجمے کے میدان میں صرف تفسیر ابن کثیر کا ترجمہ کرنے پر بس نہیں کی بلکہ مشہور محدّث امام محمد حیات کی عربی تالیف ''فتح الغفور فی وضع الایدی علی الصدور'' کا اردو ترجمہ کر کے ''سنتِ محمدی'' کے نام سے شائع کیا۔ مولانا نے بذاتِ خود ربیع الاوّل 1346ھ (ستمبر 1927ء) میں اسے پہلی بار شائع فرمایا تھا۔

نیز "برہانِ محمدی" کے نام سے قاضی القضاۃ محدّث و مفسر مفتیِ اعظم شیخ تقی الدین سبکی کے رسالہ "جزء رفع الیدین" کا اردو ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اس میں صرف وہ احادیث جمع کی گئی ہیں، جن سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ نماز میں رفع الیدین کرنا سنت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاوقتِ وفات، خلفائے راشدینؓ، عشرہ مبشرہؓ، تمام صحابہ کرامؓ، محدثینِ عظام اور ائمۂ عالی مقام اس سنت پر عمل کرتے رہے۔ ہمیں بھی اس پر عمل کرنا چاہیے۔

مولانا کی ایک اور کتاب 'سیرتِ محمدی' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری بیان کی گئی ہے۔ دراصل یہ کتاب امام ابو جعفر ابن جریر طبری (224ھ-310ھ مطابق 839-942ء) کی "خلاصة السير" کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان، ازواج مطہرات اور اولاد اطہار وغیرہ کا مفصل تذکرہ ہے۔ چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کی ابتدا میں تصنیف کردہ اس کتاب کے عربی متن کو بھی اس اردو کتاب کے ساتھ طبع کر دیا گیا ہے۔

"امامِ محمدی" حضرت مولانا کا ایک بہت اہم علمی کارنامہ ہے جو درحقیقت محدّث علامہ خطیب بغدادیؒ کی مشہور کتاب "تاریخ بغداد" کا ایک حصہ ہے۔ اس میں امام ابو حنیفہؒ کی مختصر سوانح حیات اور ان کے بارے میں ان کے ہم عصر ائمۂ مجتہدین کے خیالات و آراء کا مفصل تذکرہ ہے۔ ہر بات پوری طرح مدلّل و مبرہن ہے اور نہایت تفتیش و تحقیق کے بعد اسے شامل کتاب کیا گیا ہے۔ اصل عربی کتاب پانچویں صدی ہجری کی تالیف ہے اور بہت سی معلومات کا مجموعہ ہے۔

"فضائلِ محمدی" نام کی کتاب بھی حافظ ابو بکر احمد خطیب بغدادی کی قابل قدر تصنیف "شرف اصحاب الحديث" کا اردو ترجمہ ہے۔ مدینہ منوّرہ کے کتب

خانے میں اس کتاب کا قلمی نسخہ موجود تھا، حج بیت اللہ کے موقعے پر مولانا اس کی نقل ساتھ لے آئے تھے، پھر اس کا ترجمہ کر کے مع عربی متن کے شائع فرمادیا تھا۔ اس کتاب میں قبر پرستی اور شرک و بدعت کے خطرناک نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔ دینی معاملات میں قرآن وسنت کو ترک کر کے شخصی آراء اور قیاس کو ترجیح دینا کس قدر نامناسب معاملہ ہے، اس کا تذکرہ اور اس کے بارے میں تنبیہات کا ذکر ہے۔ علاوہ بریں حفظِ حدیث اور مذاکرہ و ممارست، علوم حدیث کی فضیلت، قرآن و حدیث میں اہل حدیث کی منزلت اور دور حاضر میں تحریک اہل حدیث اور اس کی تشکیل جدید وغیرہ کے متعلق اس کتاب میں مفصل تذکرہ کیا گیا ہے۔

"ایمانِ محمدی" نام کی کتاب حضرت امام ابو بکر احمد البیہقیؒ (374-457ھ مطابق 975-1066ء) کی تصنیف "مختصر شعب الایمان" کا اردو ترجمہ ہے۔ احادیث صحیحہ میں ایمان کی ستتر (77) شاخوں کا ذکر ہے، ہر شاخ کی مفصل تشریح قرآن وسنت، سلف صالحین اور بزرگوں کے اقوال کی روشنی میں کی گئی ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ (164-241ھ مطابق 780-855ء) کی عربی کتاب "كتاب السنة" یا "عقيده اهل السنة" کا سلیس اور دلکش اردو ترجمہ مولانا جونا گڑھی نے "عقائد محمدی" کے نام سے کیا ہے۔ عقائد سے متعلق یہ بے نظیر کتاب ہے۔ مولانا صاحب خود امام احمد بن حنبلؒ کی اس کتاب کے ترجمہ کے شروع میں تحریر فرماتے ہیں:

> "اس کتاب میں مذکور تمام عقائد میں سے کوئی عقیدہ اگر کسی کے اندر نہ پایا جائے تو اس کا ایمان باقی نہ رہے گا اور اسے اہل سنت والجماعت کا فرد نہ مانا جائے گا۔"

دیگر تصنیفات ایک نظر میں

گزشتہ سطور میں مولانا کی چیدہ چیدہ کتابوں کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے، اب ذیل میں حضرت مرحوم کی دیگر تصنیفات کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔ان میں ہر کتاب، وہ چھوٹی ہے یا بڑی، اپنے مشمولات کے اعتبار سے بے حد اہمیت کی حامل ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	سن اشاعت	تعداد صفحات	مختصر کیفیت
1	”درایتِ محمدی“	اول 1927ء	106	”ہدایۃ“ پر تبصرہ
2	”زکوۃ محمدی“	سوم 1927ء	16	مولانا منتصر رحمانی نے ترجمہ کیا
3	”ہدایت محمدی“	سوم 1928ء	20	”ہدایہ“ پر تبصرہ در تبصرہ
4	”برات محمدیہ“	سوم 1931ء	12	خواجہ حسن نظامی کی تردید میں
5	”انعام محمدی“	نہم 1931ء	8	فلسفۂ عید اور مسائل عید سے متعلق
6	”اذان محمدی“	دوم 1931ء	8	(مقدمے کے علاوہ) سحری کے وقت اذان کے بارے میں
7	”مرحمت محمدی“	دوم 1934ء	100	بالجبر فعل گناہ کے بارے میں
8	”مملکت محمدی“	دوم 1934ء	12	سلطان ابن سعود کی تائید میں
9	”تعویذ محمدی“	اول 1934ء	20	مولوی احمد علی بریلوی کی تردید میں
10	”جماعت محمدی“	دوم 1935ء	33	عورتوں کی جماعت عید اور نمازِ جمعہ میں شرکت کے بیان میں
11	”فرمانِ محمدی“	دوم 1935ء	12	زیارت قبور کا مسنون طریقہ

12	”سراجِ محمدی“	اول1936ء	60	مجلہ ’فقیہ‘ امرتسر کی تردید میں
13	”مشکوٰۃ محمدی“	اول1936ء	148	شرک و بدعت اور غیر اسلامی رسموں کی تردید میں
14	”شمع محمدی“	سوم1937ء	142	مخالف حدیث فقہی مسائل
15	”تحفہ محمدی“	سوم1937ء	12	عید قربان اور اس کی شرعی حیثیت
16	”ارشادِ محمدی“	اول1937ء	84	مولانا تھانوی کی ’الاقتصاد‘ کے متعلق
17	”مقالہ محمدی“	اول1937ء	16	دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے سترھویں سالانہ اجلاس میں صدارتی خطاب
18	”نور محمدی“	اول1938ء	100	قوالی اور باجے گاجے کی تردید
19	”نکاح محمدی“	اول1938ء	100	غائب شدہ شوہر کی بیوی کے نکاح اور مجلسِ واحد میں طلاقِ ثلاثہ کے بارے میں
20	”ملت محمدی“	اول1928ء	28	ایک مقلد عالم کی ایک کتاب کی تردید
21	”اربعین محمدی“	دوم1938ء	20	چالیس احادیث نبوی کے حفظ اور اس کی فضیلت سے متعلق
22	”صیام محمدی“	چہارم 1938ء	20	رمضان میں تراویح، شب قدر اور اعتکاف وغیرہ سے متعلق مسائل
23	”نماز محمدی“	اول1938ء	24	اپنے گھر یا سفر میں نماز کے احکام

24	"حج محمدی"	دوم 1938ء	8	حج وعمرہ وغیرہ کے بیان میں
25	"نصیحت محمدی"	دوم 1938ء	24	اندور سے شائع ہونے والے رسالے 'محرم الحرام' کی تردید میں
26	"سلام محمدی"	اول 1939ء	12	جنوبی بھارت کے صوفی ابوالخیر احمد علی کے جواب میں
27	"ریحان محمدی"	ششم 1939ء	8	کربلااور تعزیہ کی شرعی حیثیت
28	"ذمہ محمدی"	اول 1940ء	88	شرک و بدعت کے خلاف حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ملفوظات
29	"غنئیہ محمدی"	اول 1940ء	44	ذمہ محمدی کادوسرا حصہ
30	"توحید محمدی"	چہارم 1940ء	36	مکہ مکرمہ کی قبروں کو پختہ بنانے کی تردید میں
31	"ثوبان محمدی"	دوم 1940ء	16	نذرونیازاور پیرومرشد کی قبروں پر چادروغیرہ چڑھانے سے متعلق
32	"صراط محمدی"	دوم 1940ء	16	کربلاوتعزیہ کی حقیقت
33	"لولوٗ محمدی"	اول 1940ء	12	محمد نام رکھنے کے جواز سے متعلق
34	"صمصام محمدی"	اول 1940ء	24	توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں
35	"تائید محمدی"	دوم 1940ء	23	تقلید شخصی کے بارے میں
36	"ضرب محمدی"	سوم 1940ء	8	150 سوالوں کا مجموعہ
37	"آئینہ محمدی"	چہارم 1945ء	20	امتِ مسلمہ کی پوشاک اور شکل و صورت وغیرہ کا بیان

38	"عقائد محمدی"	اول 1945ء	12	عقائد کے بیان میں ایک عربی رسالے کا ترجمہ
39	"سنت محمدی"	سوم 1945ء	8	ایک عربی رسالے کا ترجمہ جس میں سینے پر ہاتھ باندھنے کے بارے میں مفصل تذکرہ ہے۔
40	"دلائل محمدی"	ششم 1945ء	16	کئی اجزاء میں شائع شدہ اس کتاب میں نمازیوں کو مسجد سے نہ نکالنے کا بیان
41	"عقیدۂ محمدی"	گیارہواں ایڈیشن 1945ء	14	دوسرے کتابچوں کے ساتھ یہ انگریزی میں مترجم ہے۔
42	"صلوۃ محمدی"	نہم 1946ء	32	یہ بنگلہ زبان میں مترجم ہے اور شائع بھی ہوئی ہے۔
43	"معراج محمدی"	سوم 1946ء	12	معراج جسمانی تھی یا روحانی؟ اس سوال کے جواب کے علاوہ اس میں بعض بدعتوں کا بیان
44	"درود محمدی"	دوم 1950ء	28	سالانہ عرس، چہلم اور دوسری بدعتی رسوم کی تردید کی گئی ہے۔
45	"میلادِ محمدی"	ششم 1950ء	28	قرآن وحدیث اور فقہ سے مروجہ میلاد کی تردید
46	"حیاتِ محمدی"	ہفتم 1950ء	24	اس مسئلے کا بیان کہ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب نہ تھے۔
47	"درۂ محمدی"	پنجم 1970ء	16	فرقہ بندی اور مذہب سے متعلق

				بہت سے سوالوں کا جواب۔
48	"طریق محمدی"	1972ء	200	تقلید شخصی کے اثرات کا بیان

علاوہ ازیں مولانا موصوف کی دیگر مصنفات کے صرف نام ذیل میں لکھ دیے گئے ہیں۔

49- "حقوق محمدی"
50- "رکوع محمدی"
51- "شہادت محمدی"
52- "صدائے محمدی"
53- "ظفر محمدی"
54- "ظل محمدی"
55- "عصائے محمدی"
56- "عید محمدی"
57- "پیغام محمدی"
58- "فتوی محمدی"
59- "قبلۂ محمدی"
60- "گلدستۂ محمدی"
61- "قربانیٔ محمدی"
62- "اشعار محمدی"
63- "انصارِ محمدی"
64- "وضؤ محمدی"
65- "وظیفۂ محمدی"
66- "انصارِ محمدی"
67- "مولودِ محمدی"
68- "حرمتِ محمدی"
69- "فتح محمدی"
70- "فیصلۂ محمدی"
71- "حقیقتِ محمدی"
72- "امام محمدی"

بلا شبہ یہ بہت بڑا اور انتہائی قابل قدر علمی اور تصنیفی ذخیرہ ہے جو حضرت مولانا محمد جونا گڑھی رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیں عطا فرمایا۔ اس ذخیرے میں تمام ضروری مسائل کی وضاحت کردی گئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان کی تمام تصانیف کی یہ فہرست

مکمل نہ ہو، کچھ اور کتابیں بھی ہوں جو ہمارے علم میں نہ آئی ہوں۔ جن کتابوں کا کسی نہ کسی طرح پتہ چل سکا ہے، ان کے نام یہاں لکھ دیے گئے ہیں۔ یہ کتابیں کئی کئی دفعہ اور بہت تعداد میں چھپیں اور بہت پڑھی گئیں۔

وفات

1941ء کے شروع میں مولانا جوناگڑھی کے والد محترم جناب محمد ابراہیم صاحب اور مولانا کی بہن عائشہ کا چند روز کی تقدیم و تاخیر کے ساتھ جوناگڑھ میں انتقال ہو گیا تھا۔ اچانک والد اور بہن کی موت کی خبر سے مولانا بہت پریشان رہنے لگے تھے، اس لیے عزیزوں سے ملاقات کی غرض سے جوناگڑھ روانہ ہوئے۔ روانگی کے وقت پندرہ روزہ "اخبارِ محمدی" کی تمام ذمے داری اپنے لائق شاگرد مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی کو سونپ دی تھی۔

جوناگڑھ پہنچ کر مرحومین کی قبروں کی زیارت کی، ان کی اخروی فلاح و کامرانی اور مغفرت کے لیے دعا کی اور صدقہ و خیرات کیا، لیکن مولانا دہلی واپس تشریف نہ لائے۔ ایک زیرِ تعمیر عمارت کے باقی ماندہ کاموں کو مکمل کرنے کے ارادے سے جوناگڑھ میں تقریباً دو مہینے مقیم رہے۔ یہ عمارت دراصل مولانا کو بطورِ وراثت حاصل ہوئی تھی۔ جب اس کا تمام کام یہاں تک کہ سفیدی وغیرہ کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تو مولانا نے قرب و جوار کے احباب و اقارب اور غرباء و فقراء کو دعوت طعام دی اور سب کو کھانا کھلایا۔

اس موقعہ پر مولانا نے اپنی تین لڑکیوں کو بھی مع ان کے شوہروں کے مدعو کیا۔ بہر حال اس دعوت کے دن مولانا کی جدید عمارت کے صحن میں اقرباء واصدقاء کے

مابین تفریح کی مجلس جم گئی تھی، جس کے بعد مولانا نے گھر میں آتے ہی اپنی بیٹیوں سے فرمایا، تم لوگوں نے کیا پکایا ہے؟ عادت کے خلاف آج بڑی بھوک لگی ہے۔ بیٹیوں نے ادب آمیز لہجے میں جواب دیا کہ آج ہم نے متنوّع اقسام کے کھانے پکائے ہیں، آپ کا جو جی چاہے تناول فرمائیے۔

کھانے کے بعد عشاء کا وقت ہو گیا۔ مولانا نے اپنے تینوں دامادوں اور بہنوئی عثمان گاندھی سے کہا کہ تم لوگ جلدی کھانے سے فارغ ہو کر مسجد پہنچو اور آذان کے بعد میرا انتظار کرو، میں ابھی وضو کر کے آتا ہوں۔ یہ کپڑے میں اسی وقت بدلوں گا، مجھے سفید اور صاف کپڑے دو گے۔ اتنے میں ان کی قوتِ قیام مفلوج اور شمع حیات بے نور ہونے لگی اور بیٹیوں سے فرمایا بلا تاخیر جائے نماز بچھاؤ۔ اس طرح جلد جلدی عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد نہایت کمزور آواز میں فرمایا، تم لوگ میرے پاس سورہ یٰس کی تلاوت کرو، کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت کی تلقین کرو، فلاں فلاں شیشیوں میں شہد اور آب زمزم رکھے ہیں، وہ مجھے پلاؤ۔ میرا وقتِ خاتمہ قریب ہے، مجھ سے اگر تمہاری کوئی شکایت ہو تو کھلے دل سے معاف کر دو اور ٹیلی گرام کے ذریعے دہلی میں مقیم سارے گھر والوں سے معاف کرنے کے لیے کہو۔ اگر میرے ذمہ کسی کا قرضہ ہو تو جلدی بتاؤ، میں ابھی ادا کرنے کا انتظام کروں گا۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ گیارہ بجے شب تک زندہ رہوں گا۔ نئی سڑک گھنٹہ گھر کے حاجی محمد صالح کے پاس میری بیویوں اور بچوں کی معاش کے لیے سولہ سترہ ہزار روپے بطورِ امانت جمع ہیں۔ پندرہ روزہ "اخبار محمدی" کی تمام ذمے داری میرے شاگرد مولانا سید تقریظ احمد سنبھال لیں گے۔ میں اپنے والد مرحوم کی قبر کی زیارت کرنے کے لیے آیا تھا، اب مجھے بھی اسی قبر کے پاس ابدی نیند سو کر رہنا پڑے گا۔ میری میت کو دفن کرنے میں تاخیر نہ کی جائے۔ دہلی

میں بلا تاخیر میاں صاحب، حاجی شیخ عبدالرحمن صاحب اور میرے گھر والوں کو ٹیلی گرام کر دیا جائے۔

ان وصیتوں کے بعد اچانک ان کی حرکت قلب رک گئی، ان کا محوِ سخن روئے مبارک بے حس ہو گیا، پورا جسم ٹھنڈا اور بے حرکت ہو گیا۔ بہتوں نے تصور کیا کہ مولانا کچھ دیر کے لیے آرام فرما رہے ہیں، مگر یہ آرام نہ تھا بلکہ یہ ابدی سکون تھا۔ کچھ دیر کے بعد لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے ہیں۔ اس طرح یہ قامع شرک و بدعت، ہادی ملت اور دین و اسلام کا یہ چاق چوبند پاسبان سب کو سوگوار چھوڑ کر آناً فاناً ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

جمعہ کی رات گیارہ بجے انہوں نے آخری سانس چھوڑا، اس سے پچھلے جمعہ میں جوناگڑھ کی جامع مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے انہوں نے پُر تاثیر لہجے میں موت اور یتیم کے بارے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ آج میں آپ کے سامنے بعافیت زندہ ہوں، ممکن ہے آئندہ جمعہ کو نہ ہوں۔ پوری دنیا میں عموماً اور مسلم معاشرے میں خصوصاً یتیموں اور بیواؤں کی تعداد کس قدر زیادہ ہے، خدارا آپ ان کا خیال رکھیں۔ ان کے رونے اور بلکنے سے آسمان بھی پھٹ جاتا ہے، آئندہ جمعہ کو میری بیویاں بیوہ اور اولادیں یتیم ہو سکتی ہیں۔

بعد کے جمعہ میں واقعی ان کی بات سچی ثابت ہوئی اور ان کی بیویاں بیوہ اور اولادیں یتیم ہو گئیں۔ اس طرح ان کا خیال اور کلام حقیقت سے بدل گیا۔ ان کی وصیت کے مطابق دہلی میں فرداً فرداً سب کو ٹیلی گرام کر دیا گیا تھا، دہلی میں ہر جگہ ماتم کی لہر دوڑ گئی۔ اسی دوران مساجد میں نماز جنازہ غائبانہ ادا کی گئی۔ دہلی کے اجمیری گیٹ کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے والی عورتیں بالخصوص سوگوار تھیں اور بعض تو اس

غم واندوہ کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئی تھیں کیونکہ یہ سب سے زیادہ مولانا کے وعظ و نصیحت سے مستفید ہوتی تھیں اور باقاعدہ ان کی اقتدا میں نماز جمعہ پڑھتی تھیں۔ حافظ حمید اللہ صاحب اپنے اہل و عیال کے ساتھ کھانا لے کر دہلی میں مولانا مرحوم کے گھر پہنچے تاکہ سوگ وار کنبے کو صبر کی تلقین کریں، تسلی دیں اور کھانا کھلائیں۔ مولانا جونا گڑھی کی موت کی خبر نے جونا گڑھ اور دیگر شہروں کو ماتم کدہ میں بدل دیا تھا، اس وقت کے اخبار و جرائد کی وساطت سے مولانا کی موت کی خبر دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ بہت سے شعراء اور مضمون نگاروں نے اردو اور عربی میں مرثیے اور تعزیتی مضامین لکھے۔

مولانا محمد جونا گڑھی کی تمام زندگی مسلکِ اہلِ حدیث اور جماعتِ اہل حدیث کی خدمت میں گزری۔ کہیں تقریر میں اس مسلک کی حقانیت ثابت کر رہے ہیں اور کہیں مناظرے میں اس کی صداقت کی وضاحت کی جا رہی ہے۔ پھر اس سے فارغ ہوتے ہیں تو مسند تدریس بچھا لیتے ہیں۔ اس سے فرصت پاتے ہیں تو تصنیف و تالیف کو مرکزِ التفات ٹھہرا لیتے ہیں۔ اس فریضے کی انجام دہی سے کچھ وقت بچتا ہے تو کسی عربی کتاب کے ترجمے کی طرف عنانِ توجہ مبذول ہو جاتی ہے۔ وہ مضطرب دل لے کر دنیا میں آئے تھے۔ مولانا مرحوم ایک حق پرست عالم تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی فطانت اور صبر و استقامت کی قوت عطا فرمائی تھی۔ اس طرح کے عالم و فاضل کی موت در حقیقت پوری ملت کی موت ہے۔ ان کے انتقال سے پوری ملت اسلامیہ نے ایک ایسی شخصیت کو گم کر دیا جس کی تلافی ناممکن معلوم ہوتی ہے۔

فما كان هلكه هلك واحد

ولكنه بنيان قوم تهدما

(ان کا انتقال کسی عام شخص کا انتقال نہیں تھا، بلکہ اس سے پوری قوم کی بنیاد منہدم ہو گئی)

حواشی و حوالہ جات

1 - تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد اسحاق بھٹی، ''حرف چند''، مشمولہ ''مولانا محمد علی جوناگڑھی،''(تالیف: محمد مجیب الرحمن) دار الدعوۃ السلفیۃ، شیش محل روڈ لاہور، 2003ء

2 - مشہور قانون دان اور سیاسی لیڈر سید حسین شہید سہروردی جو آزادیٔ برصغیر سے قبل بنگال کے وزیر اعظم رہے، آزادی وطن کے کئی سال بعد پاکستان کے وزیر اعظم منتخب کیے گئے۔ انہوں نے دسمبر 1963ء میں وفات پائی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد اسحاق بھٹی،'' حرف چند''، مشمولہ ''مولانا محمد علی جوناگڑھی''، (تالیف: محمد مجیب الرحمن) دار الدعوۃ السلفیۃ، شیش محل روڈ لاہور۔، 2003ء۔

3 - یہ اردو ترجمہ حال ہی میں مکتبہ قدوسیہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس میں حضرت امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بھی درج ہیں اور حضرت مولانا جوناگڑھی رحمۃ اللہ علیہ کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ جس طرح باطن کے اعتبار سے کتاب کا درجہ بلند ہے، اسی طرح کتاب کے ظاہر کی خوب صورتی کا بھی پورا اہتمام کیا گیا ہے۔

4 - ''خطبات محمدی'' بھی مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار، لاہور نے اپنی روایت اشاعت کے مطابق نہایت عمدگی سے شائع کیے ہیں جو نو سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں۔

مولانا محمد اکرم خان اور ان کی قرآنی خدمات

خاندانِ مجاہدین کے چشم وچراغ مولانا محمد اکرم خان نے 1884ء میں بنگال کے حکیم پور نامی ایک دور اُفتادہ گاؤں میں آنکھیں کھولیں۔[1] مولانا اکرم خان کے والد ماجد مولانا غازی عبدالباری تحریک مجاہدین کے ایک سر گرم رہنما اور شیخ الکل میاں محمد نذیر حسین محدّث دہلوی کے شاگرد تھے۔[2] اسی مجاہد خاندان کے ایک فرد کی قبر اب تک بالاکوٹ کی سرزمین میں موجود ہے۔ غازی عبدالباری کی رفیقۂ حیات یعنی مولانا محمد اکرم خان کی والدہ ماجدہ رابعہ خاتون نے بھی میاں نذیر حسینؒ کے پاس زانوئے تلمذ طے کرتے ہوئے کتب حدیث کے چند اوراق پڑھے تھے اور اسی طرح اکرم خانؒ نے بھی اپنے بچپن میں ان سے ''بلوغ المرام'' پڑھی تھی۔

یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا کے آباؤ اجداد کا سلسلۂ نسب پنچانن لشاری نامی ایک ہندو سے جا ملتا ہے جو بنگال کے شہرۂ آفاق ہندو شاعر ٹیگور کا جدّ امجد ہے۔ جو کچھ بھی ہو یہ کوئی عار کی بات نہیں ہے۔

صرف قرآن مجید ہی مولانا اکرم خان کی زندگی بھر کی فکری، قلمی اور لسانی کوششوں کا محور رہا اور درجن سے زائد تصنیفات انہوں نے اپنے ورثہ و ترکہ میں چھوڑی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر زندگی کے تمام مراحل پر قرآن مجید کے اصولوں کو اپنایا جائے تو بدیہی طور پر حدیث شریف سے رہنمائی اور اس پر عمل کا موقع مل جاتا ہے۔ بلاشبہ آپ کے دینی و معاشرتی افکار زیادہ تر مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958ء)، مصر کے علامہ رشید رضا (1856-1934ء) اور مولانا عبیداللہ سندھی جیسے مفکرین و

دانشوروں کے افکار و خیالات سے بلا کم و کاست ملتے جلتے ہیں۔ان حضرات کی طرح آپ بھی عقلی و نقلی دلائل کو اہمیت دینے میں پیش پیش تھے اور اجتہاد کے بڑے حامی تھے۔ آئندہ چل کر قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر میں انہوں نے نہ تو کسی کی بلا سوچ سمجھ تقلید کی اور نہ ہی کسی کی اندھی پیروی کرتے ہوئے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی بلکہ عقل سلیم، دلیل قاطع اور حجت و اجتہاد کی کسوٹی پر جانچ پڑتال کے بعد ہی آگے بڑھتے رہے۔ دراصل ان کی پوری زندگی پر نیز ان کے خیالات اور تفکرات پر مذکورہ بالا مجتہدین کے افکار و خیالات کی بڑی گہری چھاپ پڑی تھی۔[3]

مولانا اکرم خان کے نزدیک اسلام کا میدانِ فکر و عمل کبھی خشک و جامد نہیں رہا بلکہ ہمیشہ سرسبز و شاداب اور کثرت عمل کی بنا پر بتدریج ترقی پذیر رہا ہے۔ مولانا اکرم خان کورانہ تقلید کی مخالفت پر دوسروں کو زندگی بھر برانگیختہ و آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔اُن کے نزدیک ماحول کے اثرات، ملکی دباؤ اور کورانہ تقلید وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو بسا اوقات انسان کی عقل سلیم، فہم و فراست اور افکار و خیالات کو فرسودہ و بیکار کر کے رکھ دیتے ہیں۔ان حالات و کیفیات کے پیش نظر ہر مفسر، مترجم اور مفکرِ قرآن مجید کو اپنی تفسیر و تاویل کی راہ میں بہت ہی چوکنا رہ کر، سنبھل کر عقل و اجتہاد کی روشنی میں گامزن ہونا چاہئے تاکہ وہ کسی قدم پر بھی راہِ راست سے بھٹک نہ جائے۔[4]

مولانا اکرم خان عربی، فارسی، بنگلہ، اردو وغیرہ زبانوں پر تقریباً یکساں عبور رکھتے تھے۔ جس طرح وہ تقریباً برجستہ فارسی نظم کہہ لیتے تھے اسی طرح بلا روک ٹوک اردو میں بھی تحریر و تقریر کے ماہر تھے۔اپنے ہی زیر ادارت ''زمانہ'' کے نام سے انہوں نے کلکتہ سے ایک اردو روزنامہ جاری کیا جو چار سال تک بڑی کامیابی و طمطراق

کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔اس کا اداریہ بڑا قیمتی اور معلوماتی ہوا کرتا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر انہوں نے عربی میں نعت لکھی۔ مختلف علوم وفنون کی تعلیم تو سب سے پہلے مولانا اکرم نے اپنے والدین سے ہی اپنے گھر میں حاصل کی۔ بعدازاں عہد تلمذ کے ابتدائی مراحل میں ہی انہوں نے کلکتہ کے قریب مشہور شہر بردوان پہنچ کر وہاں کے نامور محقق عالم حضرت مولانا نعمت اللہ کے پاس زانوئے تلمذ طے کرتے ہوئے تعلیم وتربیت حاصل کی۔ اسی بنا پر مولانا اکرم خان صاحب اپنی کتابوں میں اپنے استاذ مولانا نعمت اللہ صاحب کی تعریف وتوصیف میں رطب اللّسان نظر آتے ہیں۔[5]

1921ء میں مولانا اکرم خان نے کلکتہ سے ''سیوک'' نامی ایک اور روزنامہ نکالا۔ اس میں ''اگراسار'' یعنی ''اے نوجوانانِ اسلام! تم آگے بڑھتے ہی چلے جاؤ'' کے عنوان سے ایک باغیانہ اور ولولہ انگیز مضمون شائع کیا۔ جس کی پاداش میں انہیں فوراً علی پور کے مرکزی زندان خانے میں ڈال دیا گیا کیونکہ اس باغیانہ وپرتاثیر مضمون کو پڑھ کر فرنگیوں کے تن من میں گویا آگ لگ گئی۔ سال بھر انہیں اسی تنگ و تاریک زندان خانے کی ہوا کھانی پڑی۔ اس دوران میں وہ تفسیرِ قرآن کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ جب رہا ہوئے تو اپنے ساتھ قرآنِ حکیم کے آخری پارہ (عَمَّ) کی تفسیر کا مسوّدہ بھی ساتھ لیتے آئے، جو سرزمین بنگال کے طول وعرض میں ''سوغات قید خانہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تفسیر 1922ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔[6]

بہر کیف مولانا اکرم خان کی تخلیق ''سوغاتِ قید خانہ'' کے منظر عام پر آنے کے بعد سے ہی مفسر ومترجم قرآن کی حیثیت سے اُن کی بڑھتی ہوئی شہرت ونیک نامی بنگال کے طول وعرض میں پھیل گئی بلکہ شہرت وناموری سرحدوں کو بھی پار کر گئی۔ مگر

یہ ان کی پہلی تفسیر یا پہلی تخلیق نہیں تھی بلکہ اس سے مدت مدید قبل اس سلسلہ کی اولین کڑی تفسیر سورۃ الفاتحہ تھی جو ''اُمّ القرآن'' کے نام سے مشہور ہے۔اس پر مولانا ابو الکلام آزادؒ کے طرزِ تحریر و اندازِ بیان کی چھاپ پوری طرح نمایاں ہے۔[7] مولانا اکرم خان کی یہ سب سے پہلی تخلیق 1905ء میں ''سوغات قید خانہ'' سے کوئی سولہ سال قبل زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی تھی۔

پارہ عمّ کی تفسیر کے بعد مولانا اکرم نے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی تفسیر کی دو ضخیم جلدیں شائع کیں۔ بعد میں مغربی بنگال کے ہندوستان کو خیر باد کہہ کر جب آپ پاکستان یعنی ڈھاکہ پہنچے تو اس نئے ماحول میں نئے طرز و انداز اور کسی قدر اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تفسیر لکھنا شروع کی۔اس تفسیر کے مختلف خصائص میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اسرائیلیات اور من گھڑت باتوں کو نقل کرنے سے اجتناب کیا گیا ہے اور صرف انہی روایات و آثار کو درج کیا جو ان کے جچے تلے اصول پر پورا اُتریں۔اس سلسلہ میں مولانا اکرم نے کسی بھی لومۃ لائم اور حزب مخالفت کی مطلقاً پروا نہیں کی۔

جس طرح اس مادی دنیا میں سچی بات کڑوی محسوس ہوتی ہے عین اسی طرح حق پرست اور بے باک علمائے کرام کے جانی دشمن بھی بہت زیادہ ہوا کرتے ہیں۔ مولانا اکرم خاں کے بارے میں بھی ایسا ہی معاملہ ہوا۔ عوام تو عوام، خواص، حکام بالا اور فرمانروائے وقت تک نے ان کے بارے میں مُعاندانہ رویّہ اختیار کیا۔ مگر مولانا موصوف نے عزیمت و استقامت کا راستہ ترک نہ کیا۔[8]

مسلمانانِ بنگال کے اس بے باک و جرأت مند قائد، ان کی نشاۃ ثانیہ کے علم بردار و رہنما، بنگلہ زبان کے بابائے صحافت، شہرۂ آفاق ادیب اور محقق عالم صرف قرآنی

خدمات ہی نہیں بلکہ سیرۃ نبوی اور احادیث نبویہ سے متعلق بنگلہ زبان میں تالیفات و تصنیفات بھی معرکہ آراء ہیں۔ ہمارے سامنے ان کی تفسیری خدمات کے کئی پہلو ہیں۔ بنگلہ زبان میں اپنی کتبِ تفسیر میں انہوں نے عیسائی عقائد، ہندو نظریات اور مسلمانوں میں شرک و بدعات کی تردید میں بڑے زور دار عقلی و نقلی دلائل پیش کئے ہیں۔ نیز انسانی زندگی کے انفرادی، ازدواجی، نظریاتی، معاشرتی، معاشی و کاروباری، سیاسی اور روحانی پہلوؤں کے متعلق خدائی احکام و مصالح کی ایسی خوبصورت ترجمانی کی گئی ہے کہ اسے پڑھنے سے قارئین کے سامنے ایک مکمل نظام حیات کی جیتی جاگتی اور منہ بولتی تصویر آجاتی ہے۔ادبی زبان میں ہر آیت کارواں ترجمہ کیا گیاہے نیز تفسیری حواشی کے ساتھ ساتھ مستند احادیث نبویہ اور صحیح تاریخی واقعات بھی پیش کئے گئے ہیں اور اندھی تقلید کے خلاف نیز دور حاضر کے غلط سلط افکار اور باطل نظریات پر مدلل بحث و تمحیص کرتے ہوئے ان کی اصل بنیادوں پر کاری ضرب لگائی گئی ہے وہ اپنے مخالفین کو زیر کرنے میں وہ ہر طرح سے کامران نظر آتے ہیں۔ لیکن تاریک پہلوؤں سے چشم پوشی کرتے ہوئے میں یہ نہیں کہوں گا کہ صرف خوبیاں ہی خوبیاں ان کی کتب تفسیر کے صفحات میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں بلکہ ان میں روشن پہلوؤں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی ہیں جو کہ ایک انسانی خاصہ ہے۔

مولانا اکرم خان اگرچہ مغربی بنگال کے پرگنہ حکیم پور کے رہنے والے تھے لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے دین اسلام پر اپنی جنم بھومی کی کشش کو بھینٹ چڑھادیا۔ چنانچہ اپنے پیدائشی وطن کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر ڈھاکہ، جو اس وقت مشرقی پاکستان کا دارالخلافہ تھا، میں بس گئے۔ مسلم نظریۂ ملت سے گہری وابستگی

زندگی بھر ان کا اصول رہا ہے چنانچہ شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال کی آواز کے ساتھ اپنی آواز ملا کر وہ کہا کرتے تھے:

"مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

مولانا اکرم خان سچے محمدی خیالات و سلفی عقائد کے حامل تھے انہوں نے اپنے پرچہ کو اسی "محمدی" نام سے موسوم کیا ہوا تھا۔ متحدہ بنگال کے دیگر مذاہب، مسالک و مکاتب فکر کے حاملین سب نے متفق ہو کر مولانا موصوف کو "بابائے صحافت بنگلہ" جیسے ستودہ صفت لقب سے ملقب کیا۔

کنایۃً پہلے گزر چکا ہے کہ اردو زبان و ادب کے صف اول کے نقیب و علم بردار، حجة الملة والدین حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی زندگی، عقائد اور ان کے کارناموں کے ساتھ مولانا اکرم خان کے طرز فکر و عمل کی بڑی مماثلت و یگانگت پائی جاتی ہے۔ دونوں ایک ہی شہر یعنی کلکتہ کے باشندے ہوا کرتے تھے۔ دونوں ہی کئی رسائل، جرائد و مجلات کے ایڈیٹر تھے اور دونوں ہی اپنی زندگی کے آخری ایام میں زندان خانے کی ہوا کھاتے ہوئے، قید خانوں کی تنگ و تاریک کوٹھری کی صعوبتوں اور مشقتوں کو جھیلنے کے ساتھ ساتھ تفسیر القرآن جیسے مقدس اور مبارک کام میں شب و روز اور ہمہ تن مصروف رہے۔ دونوں نے اسلام کی سربلندی اور اپنی ملت و دین کے تحفظ کی خاطر جسمانی مشقتوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ ان دونوں عظیم شخصیتوں کی زندگی میں ایک طرف جب قید و بند کی صعوبتوں سے رہائی کے مژدے سنائی دیتے تو دوسری طرف تفسیر القرآن کے مسودے بھی حوالۂ پریس ہوتے رہے۔

میں اپنے لئے یہ بہت بڑی خوش بختی اور سعادت محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کے اتار چڑھاؤ میں ایسی قابل قدر شخصیتوں سے بھی راہ و رسم رہی۔ چنانچہ مجھے

اچھی طرح یاد پڑتا ہے کہ آج سے کوئی 30 سال قبل "اعجاز القرآن" پر ایک طویل مضمون ترتیب دے کر اسے شائع کرانے کی غرض سے ڈھاکہ بخشی بازار اور چوک بازار کے درمیان واقع ماہنامہ "محمدی" کے دفتر میں کشاں کشاں حاضر ہوا۔ ان دنوں مولانا صاحب حینِ حیات ہی میں تھے۔ میں نے "کشاں کشاں" اس لئے بتایا کہ میری رہائش گاہ راجشاہی، ڈھاکہ سے یوں بھی بہت دور دراز فاصلہ پر ہے، مزید برآں "اعجاز القرآن" جیسے علمی و دینی مضامین ماہنامہ "محمدی" کے علاوہ دیگر ملکی جرائد و مجلات کے صفحات میں عموماً شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔

یہی وجہ ہے کہ مؤقر جریدہ "محمدی" میں دینی و مذہبی مقالات و مضامین کی بھرمار ہوتی تھی۔ اس بنا پر بھی اس میں گنجائش کم ہی ہوا کرتی تھی۔ میں دل ہی دل میں ان حالات پر غور کرتے ہوئے مدرسہ عالیہ سے ذرا آگے سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کا دفتر عبور کرتے ہوئے سہمے سہمے اور دھیمے دھیمے ماہنامہ "محمدی" کے دفتر پہنچا۔

مسلمانانِ بنگال کے ہاں سب سے زیادہ مشہور و معروف اور ہر دل عزیز روزنامہ "آزاد" کا دفتر اس کے بالکل ہی متصل تھا۔ مگر دفتر پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ مولانا موصوف وہاں تشریف فرما نہیں۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ آپ اپنے دفتر کے سامنے والے لان میں مصروف مطالعہ ہیں۔ جب میں دفتر سے باہر نکلا آپ کرسیٔ استراحت (Easy Chair) پر جلوہ افروز سہ پہر کی میٹھی میٹھی دھوپ تاپ رہے ہیں۔

دریں اثناء یک لخت ان کے سامنے ہو کر میں نے ان کے تفکرات میں خلل اندازی کر دی۔ وہ چونک پڑے۔ علیک سلیک کے بعد میں نے وقت کو موزوں و مناسب سمجھ کر ان کے ہاتھ میں اپنا مضمون تھما دیا۔ مضمون ہاتھ میں لے کر تادیر وہ ورق گردانی

کرتے رہے پھر پڑھنا شروع کر دیا۔ ایک دفعہ میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے لب پہ ہلکی سی مسکراہٹ کھل گئی ہے۔ پھر وفورِ شادمانی و مسرّت سے وہ فرمانے لگے: چلو یہ اچھا ہوا کہ تم نے ہاتھ میں قلم لیتے ہی ایک جدید اور اچھوتے موضوع پر بخوبی روشنی ڈالنے کی سعی سعید کی ہے۔ یہ مضمون میرے ہی زیر ادارت ماہنامہ "محمدی" میں ضرور قسط وار اشاعت پذیر ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

اس روز مولانا مرحوم کی زبان مبارک سے یہ امید افزاء کلمات سن کر واقعی میرے نہاں خانۂ قلب اور گوشہ جگر میں مسرّت و شادمانی انگڑائیاں لینے لگی۔ مولانا اکرم خان جیسی معمر و سن رسیدہ بزرگ، ایسی قابل قدر و مایۂ ناز ہستی اور بلند پایہ شخصیت آج ہم میں موجود نہیں۔ وہ سلفی عقائد کے حامل تھے اور اپنے آپ کو کسی امتی کی طرف نسبت کرنے کی بجائے خود آقائے نامدار، ھادیٔ عالم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا بدرجہا بہتر سمجھتے تھے۔[9]

مولانا محمد اکرم خاں کی زندگی کے آخری ایام میں ایک دفعہ جمعہ کے دن ان سے میری ملاقات کا اتفاق بنگشال کی جامع مسجد میں ہوا۔ مولانا بڑی شفقت و محبت سے پیش آئے۔ اپنی جسمانی نقاہت کا تذکرہ کرنے لگے۔ اس وقت میرے خواب و خیال اور تصور میں بھی نہ تھا کہ ہماری یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوگی۔[10]

اس واقعہ کے چند مہینوں کے بعد ہی 18 اگست 1968ء کو ریڈیو، ٹیلی ویژن اور روزناموں میں یکا یک ان کی خبر مرگ نشر و شائع ہوئی تو دل کی گہرائی سے ایک ہوک سی اٹھی پھر راجشاہی سے ڈھاکہ پہنچ کر ہر چند ان کے جنازہ میں شرکت کی کوشش کی مگر موانعات و عوائق اس قسم کے حائل ہوگئے کہ شرکت سے قاصر ہی رہ گیا۔

بہر کیف مولانا کے جیتے جی اور ان کے انتقال پُر ملال کے بعد بھی "اعجاز القرآن" (قرآنی کرشمہ) کے عنوان سے میرا وہ مضمون تقریباً دو سال تک مسلسل اور بالاقساط ماہنامہ "محمدی" کے صفحات کی زینت بنتا رہا۔ بالآخر اسے پڑھ کر ملک بھر کے مذہبی طبقے بصد تاکید واصرار مجھے لکھتے رہے کہ جس طرح بھی بن پڑے اسے کتابی شکل دے دی جائے۔ بالآخر کسی مہربان ناشر نے اسے چھاپ ہی دیا۔ پھر قبولیت عامہ اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ تین چار سال میں ہی اس کے تین تین ایڈیشن نکل گئے۔[11] ہر ہر ایڈیشن کی تعداد چھ یا ساتھ ہزار سے ہر گز کم نہ تھی۔ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کو بھانپ کر اسے اردو کا جامہ بھی پہنا دیا گیا جو بنارس میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ مولانا آج اگر بقید حیات ہوتے تو دونوں ایڈیشنوں کو دیکھ کر مسرور ہوتے۔

"اعجاز القرآن" کے علاوہ "معراج القرآن"، "فضائل القرآن"، ہر گھر میں قرآن اور مکمل تفسیر ابن کثیر کا بنگلہ زبان میں ترجمہ وغیرہ میری یہ تمام کتابیں بھی دراصل مولانا محمد اکرم خان کی پیہم ترغیبوں کا لازمی ثمرہ ہی ہیں، **فجزاہ اللہ احسن الجزاءفی الضریح والعقبیٰ**۔

پہلے ہی یہ بتایا جا چکا ہے کہ مولانا نے اکثر وبیشتر اپنے اسلاف اور سابقین اولین کی اسیری زندگیوں کی سر گرمیوں اور ان کے اثرات و نقوش سے متاثر ہو کر ہی کا سلسلہ شروع کیا تھا اپنے تمام تر پیشرؤں میں سے جن شخصیات سے وہ متاثر ہوئے ان میں سر سید احمد خان کی شخصیت بھی تھی۔[12]

یہی وجہ ہے کہ آیات کی تفسیر و تشریح کے دوران دونوں کے مابین اختلاف آراء بھی پایا جاتا ہے۔ یہ تضاد کبھی تو بنیادی اصول ودلائل میں ہے اور کبھی دلائل فروعیہ

کے ضمن میں ہے۔ جا بجا دونوں کے استدلال، استنباط واجتہاد کی روش، اصول اور پیرایہ بیان میں بھی بنیادی فرق ہے۔

بہر حال میرا مقصود ومنشاء یہاں پر یہی ہے کہ مختصر ساتقابلی جائزہ لے کر دونوں (سر سید احمد خان اور مولانا اکرم خان) کے موقف کو بشرط امکان کسی حد تک اجاگر کر دیا جائے۔اوّل الذّکر یعنی سر سید کے استدلال کی اصل کسوٹی انسان کی عقل ہے، نیز صرف قرآن مجید کو ہی وہ قانونِ شریعت کا اصل منبع وسرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم وحدیث نبوی کو چنداں درخورِ اعتناء نہیں سمجھتے۔ علاوہ ازیں مغرب کی جدید تہذیب وتمدّن کے حمایتی ہوتے ہوئے موجودہ دور کے علومِ جدیدہ اور سائنس کی نت نئی ایجادات سے وہ مرعوب بھی ہوئے اور صحیح معنوں میں اس کے دلدادہ بھی بنے۔[13]

اس کے برعکس مؤخرالذکر یعنی مولانا اکرم خان عقل سلیم اور وجدان واجتہاد کے ساتھ ساتھ سلف صالحین کے موقف، اجماعِ امت اور خصوصاً احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تفسیر القرآن اور دین وشریعت کے لئے اصل الاصول سمجھتے تھے، نیز وہ مغربی جدّت پسندی، اس کی نت نئی تہذیب وتمدّن، اس کی برہنگی وانحرافِ دین وغیرہ سے نالاں، برگشتہ اور بدظن بھی تھے۔ وہ دل سے یہ چاہتے تھے کہ شریعت کے ٹھوس اصول، عقل سلیم، براہین قاطعہ نیز اجتہادی طرز فکر اپنا کر تفسیر القرآن کے ذریعے موجودہ دور کے جدید رجحانات کے ساتھ اسلام کی عین مطابقت وموافقت پیدا کریں اور اس طرح سے امت مسلمہ کی نئی پود اور نوجوان طبقے کو بے راہروی، گمراہی، اخلاقی پستی اور انحطاط سے ہٹا کر راہِ راست پر گامزن کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

مولانا کا یہ موقف حق بجانب تھا اور اس ضمن میں ان کی نگارشات بڑی مبسوط و مدلل ہیں۔

پھر خالق کائنات اللہ رب العزت سے ان کی امید قوی وابستہ تھی کہ ان کی یہ پیہم جدوجہد اور سعیٔ بلیغ بے سود و رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ ہر لحاظ سے کارگر و بار آور ثابت ہو گی۔ چنانچہ آئندہ چل کر ایسا ہی ہوا اور پھر ان کا یہ حسین خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا اور ان کی توقعات بھی حقیقت بن کر نمودار ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حین حیات اور واصل بحق ہونے کے بعد بھی بنگال پر مولانا کے نظریہ اور فکر و دانش کے گہرے اثرات کی چھاپ نمایاں ہے۔[14]

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے دونوں (سرسید خاں اور مولانا اکرم خاں) کے مابین جو تقابلی جائزہ (comparative study) پیش کیا ہے، اس سے یہ بخوبی پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید کے دونوں ماہرین کے درمیان کیا قدر مشترک ہے اور کیا نہیں ہے۔ چونکہ سرسید کی تفسیر میں مادہ پرستی کی چھاپ اور جھلک بڑی واضح ہے اس لئے ان کے ہم عصروں نے آگ بگولہ ہو کر بڑی شدّت سے اُس پر بے لاگ نکتہ چینی شروع کر دی۔ ان بے شمار ناقدوں میں سے دو معاصر و نکتہ چینوں کے نام تو سرفہرست ہیں جن کے تذکرہ پر ہی اکتفا کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک تو علامہ ابو المنصور ناصر الدین ناگپوری ثم الدہلوی (م 1320ھ 1902ء) ہیں اور ان کے تنقیدی شاہکار کا نام ''تنقیح البیان'' بجواب ''تفسیر القرآن'' مؤلفہ، سرسید احمد خان ہے۔ علامہ موصوف کی تنقیدی کتاب ''تنقیح البیان'' کو ان کے صاحبزادے مولوی نصرت علی صاحب نے اپنے مطبع نصرۃ المطابع دہلی سے 1980ء میں شائع کیا تھا۔[15]

اپنی تفسیر القرآن میں سر سید احمد خان فرشتوں کے وجود سے بھی انکار کر گئے اور مختلف سورتوں کے شروع میں موجود حروف مقطعات کی غلط سلط تفسیر کی۔ چنانچہ ان مقامات پر علامہ ناصر الدّین نے ان کی خوب خوب خبر لی اور انہوں نے اپنی مفصل فارسی تفسیر ''تبجیل التنزیل'' کے صفحات میں بھی سر سید پر بڑے سخت الفاظ میں نقد کیا۔ ان تنقیدات میں ان کے الفاظ اور فقروں کی درشتگی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ سر سید کو ہر جگہ ان کے اصل نام کی بجائے نیچری کہہ کر پکارتے ہیں۔[16]

سر سید کے معاصر ناقدوں میں سے ایک اور نکتہ چین حضرت مولانا محمد علی (م1887ء) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ موصوف ضلع مراد آباد کی تحصیل بچھرانوی کے رہنے والے تھے۔ ان کے سخت ترین تنقیدی شاہکار کا عنوان ''البرھان علی تجھیل من قال بغیر علم فی القرآن'' ہے۔ ان کی یہ کتاب 1885ء میں مراد آباد کے گلزارِ احمد پریس سے شائع ہوئی تھی۔ معاصرت یوں بھی آپس کی چشمک، چپقلش اور شکر رنجی کا باعث ہوا کرتی ہے لیکن یہاں پر بات ہی کچھ اور نظر آرہی ہے چنانچہ سر سید کے خلاف مندرجہ بالا دونوں نقادوں کے علاوہ بھی نقد و جرح کا ایک لا متناہی سلسلہ کار فرما ہے۔[17]

یہ بات اب بالکل ہی عیاں ہے کہ سر سید کے ہم عصروں نے جس طرح کثیر پیمانہ پر ان کی نگارشات و تحریرات پر نکتہ چینی کی ہے اسی طرح مولانا اکرم خان کی قرآنیات پر بھی نقد و جرح میں سرزمین بنگال کے اہلِ قلم نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ سر سید پر تنقیدات کی بحث کو تو ہم یہیں پر ختم کرتے ہیں۔ اب مولانا اکرم خان پر جرح و قدح اور نقد کی سرگزشت بھی کچھ نہ کچھ ملاحظہ ہو جائے۔

تحقیق حق کے سلسلہ میں مولانا اکرم خان نے جو ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا ان کے مخالفین نے بھی طیش میں آ کر ان کی تردید میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ چنانچہ ان کی ''تفسیر القرآن'' کا زیور طباعت سے آراستہ ہونے کے چند دنوں بعد ہی ضلع کُھلنا کے باسی مولوی عبدالستار صاحب نے تفسیر مذکور پر سخت تنقید کرتے ہوئے 88 صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ شائع کر دیا۔[18] اس میں انہوں نے مولانا کی شان میں نہ صرف نازیبا الفاظ استعمال کئے بلکہ سخت توہین آمیز اور فحش گالیاں دینے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ اس کے بعد پھر ضلع کھلنا کے مولانا معزالدین حمیدی صاحب نے ''شریعت'' نامی ایک ماہنامہ میں مولانا اکرم خان کے خلاف قسط وار تنقیدی مضمون شائع کرنا شروع کیا۔ ماہنامہ مذکور کے اوراق میں اس تنقیدی مضمون کی اشاعت 1924ء میں شروع ہو کر 1925ء میں اختتام پذیر ہوئی اور پھر اسے کتابی شکل دے دی گئی تھی۔[19]

مولانا میر عبدالسّلام صاحب (1895ء-1980ء) ضلع بوگڑا کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے 1931ء میں مولانا اکرم خان کے تفسیری زاویۂ نگاہ کی تردید میں ماہنامہ ''شریعتِ اسلام'' کے اوراق میں مضمون شائع کرنا شروع کیا۔ اس سے دو سال بعد 1933ء میں مولانا فیض اللہ خان صاحب نے بھی مولانا اکرم خان کی قرآنیات کی تردید میں ایک اور کتابچہ لکھ ڈالا۔ انہوں نے اسے بلا قیمت لوگوں میں تقسیم بھی کیا۔[20]

بعد ازاں چند روز ہی مشکل سے گزرنے پائے تھے کہ مولانا شمس الحق فرید پوری (1895ء-1968ء) کے ایماء پر مولانا عزیز الحق صاحب، جو کہ ڈھاکہ کے الجامعۃ القرآنیہ کے مدرس تھے، نے بھی ایک تنقیدی کتاب تحریر کی۔ اس میں انہوں نے اپنے پیشرو مولانا عبدالستار صاحب کی پوری پوری خوشہ چینی کی۔[21]

مولانا اکرم خان کا زمانۂ طالب علمی گزرنے بھی نہ پایا تھا کہ انہوں نے ایک نامہ نگار کی حیثیت سے اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی کو اپنا پیشہ اور اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ان کے سیال قلم سے لکھے گئے بے شمار مضامین ان کے ہی زیر ادارت شائع شدہ پرچوں میں اب بھی بکھرے پڑے ہیں۔ ان سب کو یکجا کیا جاتا تو ایک ضخیم کتاب بن سکتی تھی۔ علاوہ ازیں ان کی شائع شدہ کتابیں بھی اب زمانہ کی دست برد کی نذر ہونے لگی ہیں مگر افسوس ان کی اولاد، ورثاء اور پسماندگان کو اس کی چنداں پروا نہیں ہے۔

اپنے عہد میں ایک ماہر قرآنیات کی حیثیت سے ہی مولانا نے شہرت و نیک نامی حاصل نہیں کی تھی بلکہ وہ عدیم المثال سیرت نگار بھی تھے اور معاشرتی علوم و سیاسیات کے ایک نادر الوجود ماہر فن بھی۔ بلند پایہ ادیب، شاعر اور عالم بھی اور بے شمار مذہبی و معاشرتی موضوعات پر کثیر کتب کے مصنف و مؤلف بھی۔ بنگلہ زبان وادب میں جس طرح ان سے قبل کسی نے اتنی ضخیم ترین تفسیر لکھنے کی ہمت اور پہل نہیں کی تھی اسی طرح اتنی مفصل سیرت بھی کسی نے ترتیب نہیں دی۔[22]

سیرت مذکور کے حجم کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ہی جلد 775 صفحات پر مشتمل ہے۔ 1931ء میں مطبع محمدی کلکتہ سے یہ پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد پھر دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہیں آئی البتہ حال ہی میں ڈھاکہ کے جھینوک پوستیکا والوں نے اسے دوبارہ شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ سلاست و روانی، شستہ زبان وبیان، مدلل و مبسوط مشمولات اور دلائل و براہین وغیرہ کے لحاظ سے بلاشبہ یہ کتاب بجائے خود ایک عظیم علمی شاہکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت پر لکھی ہوئی اس پہلی مبسوط کتاب کے مطالعہ سے مسلمان اور ہندو قارئین صدق دل سے اس کی داد و تحسین کئے بغیر نہیں رہ سکے اس کتاب کے الفاظ، فقرات بلکہ ہر ترکیب ہی گویا مصنف کی

انشاء پردازی، اس کی قادر الکلامی اور ادیبانہ طرز بیان کی غماز اور آئینہ دار ہے۔ اردو میں حضرت مولانا محمد سید سلیمان منصور پوریؒ کے عظیم کارنامہ ''رحمۃ اللعالمین'' اور مولانا شبلی و سید سلیمان ندوی کی ''سیرت النبی'' کو جو قدر و منزلت اور حیثیت حاصل ہے بعینہ وہی حیثیت مولانا اکرم خان کی ''سیرت مصطفی'' کو بھی حاصل ہے۔

اپنی زندگی کے آخری مراحل میں پہنچ کر معاشرتی علوم کے بارے میں بھی مولانا نے ایک کتاب تصنیف کر ڈالی۔ اس کتاب کا نام ''مسلمانانِ بنگال کی معاشرتی تاریخ'' ہے۔ یہ کتاب بھی اپنی جگہ پر نرالی اور اچھوتی ہے۔ اس کی صرف پہلی جلد ہی منظر عام پر آنے پائی تھی کہ مولانا داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ تصنیف دراصل ایک مدت مدید سے فاضل مؤلف کی دیرینہ تمنا کا ثمرہ تھی اور کئی جلدوں میں اسے ختم کرنے کا منصوبہ تھا مگر وفات حسرت آیات کے ساتھ ساتھ یہ آرزو ناتمام وادھوری رہ گئی۔

تفسیر، سیرت نگاری، معاشرتی علوم ودیگر فنون و معارف پر تصنیف و تالیف اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ مولانا اکرم تحریر وانشاء پردازی کے وسیع و عریض میدان میں ایک تیز برق رفتار شہسوار تھے۔ تقریباً ہر فن اور ہر صنفِ علم میں وہ اپنی نرالی شان اور جولانئ طبع دکھائے بغیر نہ رہ سکے۔ ''مسائل اور انکا حل'' نامی کتاب پہلے تو قسط وار مضامین کی شکل میں ان کے زیرِ ادارت ماہنامے میں شائع ہوتی رہی۔ پھر کتابی شکل میں چھپی۔ اس میں زکوۃ عشر، سود، جوا، تصویر کشی، راگ ورنگ، گانا بجانا وغیرہ سے متعلق احکام و منہیات، اوامر ونواہی زیر بحث آئے ہیں۔ اس میں اُنہوں نے مسلم معاشرہ کے پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے روزمرہ مسائل کو شرعی دلائل اور براہینِ سے حل کیا

ہے۔ بلاشبہ مسلمانانِ متحدہ بنگال کے عائلی و معاشرتی نت نئے مسائل کے الجھاؤ کو سلجھانے اور گتھیوں کو وا کرنے میں اس کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔[23]

''اسلام اور مکتی'' یعنی رستگاری کے نام سے بھی مولانا نے ایک کتاب تحریر کی تھی۔ اس میں اسلام کی بالادستی، سربلندی اور دیگر ادیان پر اس کے احسانات اور خوبیوں کو ایک ایک کر کے اجاگر کیا گیا۔ نیز دلائل، نظائر اور واضح مثالوں سے یہ ثابت کیا گیا کہ بنی نوع انسان کی نجات و رستگاری فقط احکامِ اسلام کو اپنانے میں ہی مضمر ہے۔ علاوہ ازیں جس موضوع پر اس میں خصوصی بحث کی گئی ہے وہ توحید باری تعالیٰ کا موضوع ہے۔ انسان اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرے گا۔ خواہ وہ کتنا بڑا شاہِ شاہاں، کشور کشا اور فاتحِ اعظم ہی کیوں نہ ہو۔ بعد ازاں معبودانِ باطلہ کے پرستاروں و پجاریوں کو المناک انجام سے متنبہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں قبر پرستی، مزار و شجر پرستی نیز شرک و بدعات جیسے قبیح افعال سے پرہیز اور اس کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔[24]

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ وہ اپنے ترکہ کے طور پر اور بھی بے بہا علمی خزانہ، ادبی ذخیرہ اور جواہر پاروں کا گنجینہ چھوڑ گئے ہیں جو عاشقانِ علم و عرفان اور تشنگانِ علم و فن کی پیاس بجھانے کے لئے کافی و شافی ہے۔ سچ پوچھئے تو امتدادِ زمانہ تک تاریخ کبھی انہیں نظرانداز و فراموش نہیں کر سکے گی۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ مولانا کی جولانیٔ طبع نے بہت سی اصناف علوم و فنون میں طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ وہ ایک بہترین مصنف، مفسرِ قرآن، مؤرخ اسلام اور معارف متداولہ کے علمبردار ہونے کے ساتھ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ اُن کی شاعرانہ میلانِ طبع اور ذوقِ سلیم کا مختلف مقامات و مواقع پر اظہار ہوتا رہا۔ اُن کے کلام میں جہاں

اشارۂ کنایہ اور تشبیہ و استعارہ کا حسن موجود ہے وہاں زبان کی شستگی، بے ساختگی اور سلاست کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ اپنے اشعار کے ذریعہ جہاں وہ دقیقِ فلسفہ چھانٹتے ہیں وہاں درد مند اور بے تاب دلوں کی دھڑکنوں اور کروٹوں کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شعر گوئی بنگالی میں اسلامی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ کبھی کبھار ان کے اشعار تکلف سے پاک اور تاثیر میں ڈوبے ہوئے بھی نظر آتے ہیں بلکہ جذبات کی شدت الفاظ اور فقروں کے آبگینوں کو پگھلا دیتی ہے۔ طرزِ بیان عمدہ اور زبان ستھری و نکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ مسلسل کئی سال تک انگریزی روزنامہ "کامریڈ" اُن کے زیر ادارت نکلتا رہا۔ اس زبان میں بھی انہیں درک اور دستگاہ حاصل تھی۔

اردو زبان و ادب میں مولانا کی مہارت کی بناپر 1948ء میں اُن کو انجمن ترقی اردو کا صدر منتخب کیا گیا۔ بنگلہ زبان میں انہوں نے عنفوانِ شباب سے ہی شعر و شاعری کا آغاز کیا تھا مگر ان کا کلام روزنامے اور ماہنامے کے اوراق تک ہی محدود رہا۔ کتابی شکل میں کبھی شائع نہیں ہوا۔ 1910ء میں "اطلاعات مدرسہ عالیہ کلکتہ" کے عنوان سے ایک طنزیہ نظم لکھ کر اُنہوں نے بڑی شہرت و نیک نامی حاصل کی تھی۔ دراصل اس نظم کا تاریخی پس منظر بھی تھا۔ 1943ء میں اُن کی شاعری کا ایک مجموعہ شائع ہوا تو قبولیتِ عامہ اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ (50) پچاس ہزار کاپیاں عرصہ قلیل ہی میں ختم ہو گئیں۔ اس کا نام "پاکستان نامہ" (یعنی خداداد اسلامی حکومت) تھا۔

مولانا اکرم خان کے انتقال کو تیس سال بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ان کی درجنوں سوانح عمریاں مرتب ہو کر منظرِ عام پر آ گئیں حتی کہ ان پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے بھی کئی تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹریٹ کی

ڈگری تو ماشاءاللہ کلکتہ یونیورسٹی سے میرے ہاتھوں اور میری ہی وساطت سے تفویض ہوئی۔[25]

اس سلسلہ میں کلکتہ شہر سے جو پہلی اور ضخیم سوانح عمری شائع ہوئی وہ وہاں کے مشہور و معروف محقق عبدالرحمن کی قلمی کدو کاوش کا نتیجہ تھی۔ بعد ازاں میرے ہی ایک ہمدم جناب ابو جعفر اقبال نے کلکتہ میں مولانا کی حیات و خدمات پر بنگلہ و انگریزی زبانوں میں دو کتابیں لکھ ڈالیں۔

خاندانِ مجاہدین کے چشم و چراغ مولانا محمد اکرم خان نے 1884ء میں بنگال کے دور افتادہ گاؤں حکیم پور میں آنکھ کھولی اور ایک سو سال کی سرگرم زندگی بسر کرنے کے بعد 18 اگست 1968ء کو راہی ملک بقا ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ڈھاکہ بنگشال روڈ میں مالی باغ میں جو اہلحدیث مسجد واقع ہے، اسی کے متصل قبرستان میں ان کی آخری خوابگاہ ہے۔[26]

مولانا محمد اکرم خان کی شخصیت بنگلہ دیش کی طرح پاکستان کی سرزمین میں بھی یکساں طور پر متعارف و معروف ہے۔ چنانچہ اسلام آباد میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ان کے افکار و نظریات اور ہمہ جہت خدمات کے اعتراف میں سیمینار منعقد کئے گئے۔ اُن کے انتقال پُر ملال پر جہاں بنگال کے دانشوروں نے انہیں اُن کی جلیل القدر دینی و علمی خدمات پر خراجِ عقیدت پیش کیا وہاں مغربی پاکستان کے علماء، اہل سیاست و حکومت اور ادیبوں کے علاوہ مدیرانِ اخبارات و جرائد نے اپنے اپنے اخبارات و جرائد میں ان کی خدمات کو زبردست خراج عقیدت بھی پیش کیا۔

حقیقی بات یہ ہے کہ مولانا محمد اکرم خان بنگلہ صحافت کے بانی اور میدان سیاست کے عظیم قائد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اُن کے والد ماجد مولانا غازی عبدالباری خان تحریک مجاہدین کے سرخیل اور شیخ الکل میاں محمد نذیر حسین محدث دہلوی (م۔1912ء) کے شاگردِ رشید تھے۔

حواشی وحوالہ جات

[1] - روزنامہ ''جنگ'' کراچی، 1968ء، روزنامہ ''آزاد'' ڈھاکہ، 18 اگست 1968ء، ماہنامہ ''محمدی'' شمارہ اگست 1968ء

[2] - ڈاکٹر مجیب الرحمن ''بنگلہ زبان وادب میں قرآن مجید کا چرچا''، ص: 110-112، ماہنامہ ''ترجمان الحدیث'' ڈھاکہ 1986ء شمارہ اگست، ماہنامہ ''المجاہد'' 1986ء دیناجپور بنگلہ دیش۔

[3] - ماہنامہ ''محمدی'' شمارہ اگست 1968ء، ہفت روزہ ''عرفات'' شمارہ اگست 1968ء، ڈھاکہ، بنگلہ دیش۔

[4] - ڈاکٹر محمد مجیب الرحمن ''بنگلہ زبان وادب میں قرآن مجید کا چرچا'' اسلامک فاؤنڈیشن بیت المکرم، ڈھاکہ، بنگلہ دیش 1986ء، ص110۔

[5] - ایضاً، ''صحافی، ادیب و عالم محمد اکرم خان'' از قلم محمد بن عبدالرحمن 1981ء کلکتہ مغربی بنگال، انڈیا، ص: 105

[6] - خالد سیف اللہ صدیقی: بابائے بنگلہ مولانا اکرم خان، ماہنامہ ''محمدی'' شمارہ ستمبر 1969ء

[7] - ماہنامہ ''تہذیب'' ایڈٹ کردہ محی الدین شامی دوسرا شمارہ 1975ء ڈھاکہ بنگلہ دیش۔

[8] - سری جوگندرناتھ سمجھدار وسری رکھال راج رائی: ''ساہیتیاپنجیکا'' کلکتہ 1312ء بنگلہ، ص: 92

[9] - مولانا عبداللہ الکافی قریشی کا ایڈیٹ کردہ ماہنامہ ''ستیاراہی'' سال اول شمارہ 28، کلکتہ 1920ء

[10] - ڈاکٹر محمد مجیب الرحمن: 'اعجاز القرآن' تیسرا ایڈیشن ڈھاکہ 1991ء مقدمہ وپیش لفظ ص: 19-21

[11] - ڈاکٹر محمد مجیب الرحمن: 'اعجاز القرآن' بنگلہ واردو ایڈیشن کا مقدمہ وپیش لفظ محولہ بالا نیز ملاحظہ ہو ماہنامہ ''محمدی'' زیرادارت مولانا محمد اکرم خان اگست 1968ء ڈھاکہ محولہ بالا۔

[12] - قرآنیات کے مختلف موضوعات پر دونوں کی علمی خدمات وتصنیفات کی زبان اگرچہ الگ تھلگ ہے مگر طرز تحریر کچھ ملتا جلتا ہے۔ مختلف زاویۂ نگاہ سے دونوں نے قرآن کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ مثلاً سرسید نے صرف تفسیر القرآن پر ہی بس نہیں کیا بلکہ قرآن سے متعلق مختلف پیرایہ طریقوں سے لافانی وانمول جواہر پاروں کے بے بہاو بے پایاں علمی گنجینے واندوختے قرآنی یادگار کی صورت میں ترکہ کے طور پر چھوڑے ہیں۔ اس سلسلہ میں "خلق الانسان علی مافی القرآن" بھی آپ کی ایک قابل ذکر تخلیق ہے جو کہ مطبع مصطفائی لاہور سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس میں بنی نوع انسان کی پیدائش سے متعلق مبسوط اور مدلل بحث کی گئی ہے۔ آپ کی "ازالة الغین عن ذکر ذی القرنین" نامی 65 صفحات کی کتاب 1889ء میں مفید عام پریس آگرا سے شائع ہوئی۔ اس میں مقدونیہ کے اسکندر اعظم سے متعلق امام رازی نے جو بحث کی تھی اس کی تردید ہے۔ اسی طرح آپ کی "الترقیم فی قصة اصحاب الکهف والرقیم" نامی 90 اوراق پر مشتمل کتاب بھی 1890ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے چھپی۔ اس میں سورۃ الکہف کے مطابق اهل الکہف کی مفصل داستان بیان کی گئی ہے۔ ان کل الجن والجان علی مافی القرآن نامی 48 صفحات کا کتابچہ بھی مطبع مذکور آگرا سے 1891ء میں شائع ہوا۔ اس میں قرآن مجید کے بیان کردہ جن وانسان وغیرہ الفاظ کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ان کی "تفسیر السمٰوات" کے عنوان پر 116 صفحات کی کتاب بھی 1909ء میں نول کشور سٹیم پریس لاہور سے چھپی تھی۔ اس میں حکمت وفلسفہ کی روشنی میں فلک الافلاک اور سماوی وجوہ سے متعلق سیر حاصل بحث مرقوم ہے۔ "تفسیر سورۃ البروج" بھی سرسید کے اسی سلسلہ قرآنیات کی ایک کڑی ہے۔ یہ بھی لاہور کے مصطفائی پریس سے طبع شدہ ہے۔ اسی طرح قرآنیات کے موضوعات پر آپ کی اور بھی کئی تصنیفات موجود ہیں لیکن اختصار کی غرض سے اور طوالت سے احتراز کرتے ہوئے ہم سردست یہیں پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اسی طرح مولانا اکرم خان کی قرآنی نگارشات کچھ تو ہم اس سے قبل ہی سپرد قلم کر چکے ہیں جن کا اب دوبارہ اعادہ نہیں کرنا چاہئے۔ (تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو مولانا الطاف حسین حالی: "حیات جاوید" طبع جدید، اکادمی پنجاب ٹرسٹ لاہور 1957ء ص:559-589، اردو ڈائجسٹ قرآن نمبر محولہ بالا ص: 938، ڈاکٹر عبدالحق: قاموس الکتب اردو محولہ بالا ص:63-64۔

[13] - ڈاکٹر محمد مجیب الرحمن: "بنگلہ زبان میں قرآن کا چرچا" ڈھاکہ 1986ء اگست محولہ بالا۔

[14] - ڈاکٹر عبد اللہ مجلہ اسلامی فاؤنڈیشن بیت المکرم ڈھاکہ اگست 1969ء محولہ بالا۔

[15] - علامہ ناصر الدین ناگپوری ثم الدہلوی: "تنقیح البیان بجواب تفسیر القرآن" اور فارسی تفسیر "تبجیل التنزیل" مطبع نصرۃ المطابع دہلی بحوالہ "علوم القرآن" علی گڑھ، ج:9، جنوری- دسمبر 1994ء افسوس کہ دونوں کتابیں نایاب ہو چکی ہیں۔ البتہ قلمی نسخہ کتب خانہ داتا گنج بخش لاہور پاکستان میں محفوظ ہے۔ (ملاحظہ ہو فہرست نسخہ ہائی خطی فارسی پاکستان، 16/1)

[16] - ایضاً

[17] - ڈاکٹر محمد مجیب الرحمن: "بنگلہ زبان میں قرآن مجید کا چرچا" محولہ بالا

[18] - Moulana Abdus Sattar: *Tafsir Name Saityer Apolop*: 1st Edition, Dhaka, p:88

[19] - Moezudin of paranpur Kolarna: Monthly "Shariat" 1st and 2nd yr. of publication.

[20] - Meer A. Salam of Syedpur Bogra: Monthly "Shariyat-e-Islam". 6th yr. 10th issue 1931. Also see: Faizullah Khan: Khan Saheber Baji Kata p.No46 and "Bengal library catalogue of books. 1st quarter, serial no. 813.pp.10-11.

[21] - Moulana Azizul Haq S/o Al-Haji Arshad Ali of Bikranpur Dhaka: "Baje Tafseer" August 1960. p:61. Also see Monthly "Tahzeeb" seerat-un-Nabi 3rd and 4th issue and British Meusium catalogue of books.

[22] - A.K. Shamsuddin: "Otit Diner Smriti" Dhaka 1968.(1st Ed.) p.p. 349-351

[23] - M. Abdur Rehman: "Literature, Monishi Moulana Akram khan: Calcutta 1980 (1st Ed.) pp.42-46. Muhammad Jahangir: *Muhammad Akram Khan*: Bangla Academy Dhaka. February 1987. Opcit p:32.

[24] - Mujibur Rehman Khan: Monthly "Muhammadi" Tafseer- ul-Quran(article 1989; Prof. Monsurddin: Bengali Muslim Sadhana : Vol.II

[25] - Muhammad Qased Ali: *Moulana Akram Khan : His life an works*, Arabic Deptt. Calcutta University 1990.

[26] - روزنامہ "پاکستان" ڈھاکہ، 1968ء؛ ہفت روزہ "عرفات" ڈھاکہ، 1968ء

بنگال کے ایک نامور اُردو شاعر احسن احمد اشک

دنیا میں بہت سارے افراد ایسے ہیں جو اپنے تعارف اور پہچان کے لئے اپنے علاقوں کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے مخصوص علاقوں پر فخر کرتے ہیں مگر کچھ گنے چنے افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر علاقوں کو فخر ہوتا ہے اور ان مخصوص علاقوں کی پہچان اور تعارف کے لئے ان نامور معزز افراد کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اسی قبیل سے تعلق رکھنے والی ایک شخصیت جس پر بنگال کی سرزمین کو ہمیشہ بجا طور پر ناز رہا وہ احسن احمد اشک جیسے شاعر کا وجود ہے۔ ان کا تعلق بنگلہ دیش کے سرسبز و شاداب اور زرخیز علاقہ چاٹگام کے بانس کھالی سے ہے۔ ان کا تخلص اشک اور نام احسن احمد ہے۔ ان کے دادا قاضی سعادت علی صاحب عربی و فارسی کے ماہر اور اپنے زمانہ میں علم کلام، حدیث، فقہ اور دینیات کے ایک جید عالم و فاضل تھے۔ وہ اپنے علاقہ کے قاضی القضاۃ تھے۔

ان کے والد پروفیسر خان بہادر عبدالمقتدر صاحب کی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار کے زیر سایہ انجام پائی۔ پھر مزید انگریزی تعلیم کی غرض سے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے شعبہ Anglo persian سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ پٹنہ اورینٹل پبلک لائبریری میں ایک کیٹالاگر کی حیثیت سے ملازمت کرتے ہوئے خان عبدالمقتدر صاحب نے ایک بہت بڑا تحقیقی کام انجام دیا۔ بلاشبہ یہ ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ ان کا یہ عظیم کارنامہ 16 جلدوں میں کلکتہ Baptist Mission Press سے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر 1911ء سے 1917 کے دوران میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کارنامہ کا عنوان تھا "Catalogue of Arabic & Persian

Manuscripts in the Bankipur Oriental Public Library" کیٹالاگز کی قیمتی جلدیں آج کل ہمارے ہاں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ صرف یورپ وامریکہ جیسے ملکوں کی قدیم لائبریریوں میں آثار قدیمہ کی حیثیت سے خال خال ہی نظر آسکتی ہیں۔ بعد میں آنے والے براؤن اور دیگر مستشرق کیٹالاگرز نے خاص طور سے ان سے خوشہ چینی کی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تالیفات میں جابجا خصوصی طور پر عبدالمقتدر صاحب کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ اس طرح .V.C Scott o' Connor کی بھی مایہ ناز کتاب جو کہ 1920ء میں منظر عام پر آئی ہے، میں جابجا ان کا حوالہ دیا ہے۔ V.C. Scott o' Connor کی اس کتاب کا نام "An Eastern Library" ہے۔ (میں تو ذاتی طور پر ان سے اور بھی زیادہ متاثر ہوں تاہم ان کے متعلق تفصیلی تذکرہ اور خامہ فرسائی کو کسی دوسری نشست کے لیے سردست ملتوی چھوڑتا ہوں)

1919ء کی پہلی جنوری کو کلکتہ کے اسی شریف گھرانے میں اشک صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ وہیں پروان چڑھے، وہیں نشوونما پائی۔ اشک صاحب بچپن سے ہی بڑے باصلاحیت اور سمجھدار تھے۔ اُنہوں نے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم حاصل کی۔ اسی سرکاری ادارہ میں اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کی حیرت انگیز وغیر معمولی لیاقت کا ظہور ہونے لگا۔

اس زمانہ میں وہاں بنگلہ ادب اور زبان رائج نہیں ہوئی تھی بلکہ انگریزی ذریعہ تعلیم رہی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی کے توسط سے ہی انہیں اردو فارسی کی تعلیم حاصل کرنا پڑی۔ اشک صاحب نے اردو، فارسی شعبہ میں تعلیم پائی اور ایم، اے، کے فائنل

امتحان میں اول آئے۔ اشک صاحب زمانہ طالب علمی میں اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسیات میں بھی نمایاں حصہ لینے لگے۔

اشک صاحب کی خداداد صلاحیتوں اور سنجیدہ فہمی نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا، یہی وجہ ہے کہ کبھی بھی اور کسی بھی مسئلہ میں ان کو شرمندگی اور لغزش کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان کی خوابیدہ صلاحیت اور قابلیت کو جلا بخشنے میں جناب جمیل مظہری نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے وہ خود بھی حیرت انگیز وغیر معمولی عبقریت و صلاحیت کے حامل تھے؛ چونکہ اپنی طالب علمی کے دور سے ہی ان کا گہرا رابطہ جمیل مظہری سے قائم ہو گیا تھا اس لیے ان سے ہر طرح سے استفادہ کرنے کا موقع بھی میسر آگیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علمی، ثقافتی اور ادبی میدان میں کبھی دوسروں سے پیچھے نہیں رہے اور بہت ہی لائق، فائق اور ممتاز نظر آنے لگے۔

1934ء کے اوائل میں مزید تعلیم کے حصول کی غرض سے کلکتہ اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے، جہاں ان کو 'مولانا وحشت' جیسی لائق اور قابل قدر ہستی سے پوری طرح اپنی علمی تشنگی بجھانے کے مواقع میسر آئے۔ خوش قسمتی سے مولانا وحشت کی شاگردی نے ان کی خفیہ حذاقت و صلاحیت کو چار چاند لگائے۔ وحشت صاحب ان دنوں اسی کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ اس زمانہ میں مولانا وحشت کے ہاں باقاعدہ طور پر ہر اتوار کو زبان و ادب کے پروانے اور تلامذۂ خاص اکٹھے ہوا کرتے تھے، شعر و ادب کے موضوع پر خوب دل کھول کر گفتگو ہوا کرتی تھی اور تازہ کلام بھی سنایا جاتا تھا۔ اس ادبی مجلس میں اوروں کے ساتھ جناب جمیل مظہری بھی شرکت فرمایا کرتے۔ اشک اس وقت اپنی عمر کے لحاظ سے چھوٹے تھے تاہم فطری طور پر شعر و ادب کے شیدا و دلدادہ ہونے کی بنا پر وہ بلاناغہ اس مجلس میں شریک ہو کر بھرپور حصہ لیا کرتے تھے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاں بھی ہر جمعہ کو ایک ادبی پروگرام ہوا کرتا تھا۔ جس میں ان کے حلقۂ احباب، نیاز مند تلامذہ اور خاص متعلقین حصہ لیا کرتے تھے۔ اس مجلس کے شرکائے کار میں سے جناب جمیل مظہری، قمر صدیقی اور پروفیسر طارق رضوی کے نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ گفتگو کا اکثر و بیشتر حصہ مولانا ابوالکلام کی گل افشانئ گفتار اور بے نظیر اندازِ بیان پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ علم وہنر اور شعر و حکمت کی یہ مؤقر مجلس اس وقت تک جاری رہی کہ جب مولانا موصوف سیاسی ہنگاموں میں پوری طرح منہمک اور مصروفِ پیکار نہ ہوئے تھے۔ مولانا آزاد کی ان وقیع مجلسوں میں جن حضرات کو باریابی کا شرف اور فیضیابی کی سعادت نصیب ہوئی، ان میں ایک خوش قسمت جناب اشک بھی ہیں۔

انہی دنوں کلکتہ میں آرزو لکھنوی اور ناطق لکھنوی تشریف فرما تھے اور دونوں میں معاصرانہ چشمک پورے جوبن پر تھی۔ ایک دوسرے کے وہ بالکل قائل نہ تھے مگر اشک کے دل کی پنہائیوں میں دونوں کے لئے عزت واحترام کے جذبات یکساں طور پر موجزن تھے، بنابریں وہ دونوں سے ملتے اور استفادہ کرتے رہے۔

1937ء میں اشک صاحب نے کلکتہ اسلامیہ کالج سے بی۔اے آنرز کی تکمیل کرتے ہوئے کلکتہ یونیورسٹی میں ایم۔اے کرنے کی غرض سے داخلہ لے لیا چنانچہ انہوں نے وہاں بھی امتیازی حیثیت ونمبروں کے ساتھ گولڈ میڈل لے کر شاندار کامیابی حاصل کی۔ اس میں بھی ان کا مضمون فارسی زبان وادب تھا۔

1941ء میں انہوں نے (Modern Indian Languages (Pali, Parakirt, Hindi and Urdu میں دوسری دفعہ ایم۔اے کیا اور اس امتحان میں بھی اوّل آئے اور گولڈ میڈل کے حامل ہوئے۔ یونیورسٹی میں

طالب علمی کے زمانہ سے انہیں اپنے اساتذۂ کرام سے کہیں زیادہ ڈاکٹر رادھا کرشنن سے لگاؤ اور دلچسپی رہی۔ ان دنوں ڈاکٹر رادھا کرشنن فلسفے پر توسیعی خطبات (Extension Lectures) دیا کرتے تھے۔ فکری لحاظ سے اشک صاحب نے ان سے کافی استفادہ کیا۔ فلسفہ کے پروفیسر رادھا کرشنن کے علاوہ پروفیسر ہمایوں کبیر (انگریزی لٹریچر) اور پروفیسر شاہد سہروردی (شعبہ فائن آرٹ) وغیرہ سے بھی ان کا گہرا رابطہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کی زندگی میں انہوں نے جتنے بھی اقدامات کیے ہیں، سب میں ہی فکری پختگی نظر آتی ہے۔ کسی بھی مسئلہ پر خواہ وہ ادبی ہو یا سیاسی اس میں اتنا ہی وقت، توجہ اور انہماک وہ صرف کیا کرتے تھے جتنا کہ ایک کامیاب قیادت کے لئے از بس ضروری ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ بیان میں جولانی، طلاقتِ لسانی، انداز میں گل افشانی، تنقید و نکتہ چینی میں حقیقت پسندی اور اظہار میں عجوبہ پن ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

شہرت یافتہ ادیب و اہلِ قلم ابن انشاء ''جاگتے جزیرے'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''بنگلہ دیش کے اردو شعراء میں احسن احمد اشک سب سے نمایاں ہیں۔ ان کی پچیس سالہ مشق سخن کا حاصل یہ چند صفحات ہیں مگر جب معیار کیفیت ہو نہ کہ کمیت تو چند صفحات بھی بہت اہم نظر آتے ہیں۔ اشک کے شعری موضوعات پوری زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں جس کا اظہار اس مجموعہ کے ایک ایک لفظ سے ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ طنز بھی اشک کے کلام کا اہم جزء ہے۔ معاشرے کے خاص خاص پہلوؤں پر انہوں نے جس انداز سے نشتر زنی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔''

''جاگتے جزیرے'' دراصل 98 صفحات پر مشتمل اشک کا شعری مجموعہ 1962ء میں کراچی پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے شائع ہوا۔ اسی کے شروع میں نامور ادیب ابن انشاء نے مندرجہ بالا کلمات لکھتے تھے۔ اس کے صفحہ پر ''اژدھا'' کے

عنوان سے جو نظم درج ہے اس کا دوسرا حصہ بعنوان ''دھماکہ کے بعد'' ''After the Explosion'' ہے۔اس کا ترجمہ بنگلہ ماہنامہ ''پرتیبکھّا'' کے اگست۔ستمبر شمارہ1989ء کے صفحہ 15 پر شائع ہوا مگر مترجم کو شاید اس کا علم نہیں تھا کہ یہ ''اژدھا'' کا دوسرا حصہ ہے اور اس کا تعلق جدید دور کی ''روشنی'' سے نہیں بلکہ ایٹمی دھماکہ کی تابکاری اور اس کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں سے ہے۔

اس ''جاگتے جزیرے'' کی اشاعت سے بھی 12 سال قبل یعنی 1950ء میں اشک کی نظموں اور غزلوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ''برق و باراں'' حاجی سعید اینڈ سنز کلکتہ سے شائع ہوا۔ جس کے اکثر و بیشتر حصے کو معیاری نہ ہونے کی بنا پر اب وہ اپنی شاعری سے خارج سمجھتے ہیں۔اس مجموعہ کے شروع میں شہرۂ آفاق ادیب ڈاکٹر عندلیب شادانی نے 8-9صفحات پر مشتمل ایک قیمتی پیش لفظ قلم بند کیا ہے۔

مولانا محی الدین احمد قصوری رحمۃ اللہ علیہ

(چند یادیں، چند باتیں)

ہفت روزہ ''اہل حدیث'' لاہور مجریہ 14 اپریل 1971ء میں محترم ملک حسن علی صاحب جامعی کا ایک مضمون بعنوان ''مولانا محی الدین احمد بی۔اے۔ قصوری مرحوم'' نظر سے گزرا۔ ملک کے اس دور دراز خطے میں موصوف کی خبر مرگ سن کر میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ نیز اس مضمون نے مولانا مرحوم کی زندگی کی بہت سی پرانی یادیں پھر سے تازہ کردیں۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں این قصہ پارینہ را

دراصل مولانا محی الدین احمد قصوری مرحوم کے ساتھ میرے ایسے تعلقات و مراسم تھے کہ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت ہے کہ آپ کی نوازشات، لطف و کرم اور شفقت و عنایات مجھ پر اس قدر زیادہ تھیں جن کے تذکرہ سے میرا قلم قاصر ہے۔ افسوس کہ مجھ جیسے دور افتادہ کے پاس مرحوم کی مغفرت کے لئے پر خلوص دعاؤں کے علاوہ اور کچھ نہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

غالباً یہ 1957ء کی بات ہے جب وہ معلّم کی حیثیت سے درجہ تکمیل میں ہمارے سرپرست تھے۔ اسی سال جامعہ سلفیہ معرض وجود میں آیا تھا۔ لائل پور کا نام اس وقت کاغذوں میں تھا اور ہماری تعلیم شیش محل روڈ لاہور کے 'تقویۃ الاسلام' کی

عمارت میں ہوا کرتی تھی۔ استاذی المکرم حضرت مولانا داؤد صاحب غزنویؒ بھی اسی عمارت کی بالائی منزل میں قیام رکھتے تھے۔ مولانا محی الدین احمد قصوری ناظم تعلیمات کی حیثیت سے نہ صرف ہمارے تعلیمی مسائل پر پوری توجہ دیتے بلکہ ہمارے قیام وطعام، وظائف اور ہفت روزہ اجلاس میں بھی تقاریر و مذاکرات کے اہتمام میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ ہماری انجمن کے اجلاس کی کرسی صدارت کو کبھی مولانا محمد حنیف ندوی اور کبھی مولانا ابراہیم کمیر پوری زینت بخشتے۔ ہمارے ہر کام کی نگرانی کا یہ عالم تھا کہ مولانا بلاناغہ مزنگ روڈ سے تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ ان کی نگرانی اور دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ ہماری زندگی کے شب وروز بڑے خوشگوار ماحول میں بسر ہوئے اور ان دنوں کی یادیں زندگی کا سرمایہ ہیں۔

مولانا کی زندگی کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان میں فروتنی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ ناظم تعلیمات ہونے کے باوجود وہ طلبہ میں گھل مل جایا کرتے تھے۔ جب مولانا محمد حنیف ندوی صاحب ہمیں "النظرات" پڑھاتے تو وہ بھی اس درس میں بالالتزام شریک ہوتے تھے۔ ہماری جماعت میں کل پانچ طلبہ تھے جنہیں ہم آپس کی اصطلاح میں "پنجتن پاک" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ میرے علاوہ دوسرے چار رفقائے درس کے نام یہ ہیں:

1. قدرت اللہ صاحب فوق
2. غلام نبی صاحب (جنہوں نے بعد میں ڈبل ایم۔اے کیا ہے)
3. قاضی محمد اسلم سیف فیروز پوری
4. مولوی عبداللہ صاحب۔

اس کے علاوہ درجہ تخصص میں تین طلبہ اور بھی ہوتے تھے۔ ان میں سے میں اکیلا ہی تھا جو جامعہ سلفیہ کے مخصوص نظام اور نصاب پر پوری طرح کاربند و عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ ادھر میٹرک کی تیاری میں بھی مصروف تھا۔ البتہ اس میں جامعہ کے قواعد وضوابط اور اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو نباہنے میں کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ فرصت کے اوقات سے فائدہ اٹھانا ایک سنجیدہ طالب علم کے لئے ضروری تھا، اس میں اگر کسی چیز کی سخت ضرورت تھی تو وہ صرف عزم مصمم تھا۔ بہر حال میری اس تیاری کے پروگرام میں جن حضرات نے میری حوصلہ افزائی فرمائی ان میں سے حضرت مولانا محی الدین احمد قصوری کی ذات ستودہ صفات خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپ وقتاً فوقتاً مجھے انگریزی بھی پڑھایا کرتے تھے اور ترجمتین میں اصلاح بھی دیا کرتے تھے۔

جامعہ سلفیہ لاہور کا سالانہ امتحان ابھی نہ ہونے پایا تھا کہ ایک روز سننے میں آیا کہ ندوۃ العلماء کے جید عالم مولانا ابوالحسن علی ندوی لاہور آئے ہوئے ہیں۔ مولانا ان دنوں غالباً بغداد یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ لاہور میں قدم رکھتے ہی علمی حلقوں میں آپ کی آمد کا مژدہ بہت تیزی سے پھیل گیا۔ ہمارے رفیقِ درس قاضی محمد اسلم صاحب کے ذہن میں فوراً یہ تجویز آئی کہ برِّصغیر پاک وہند کے اس فاضل اجل کو عصرانہ پر دعوت دینی چاہیے۔ زبانی بات چیت کے ساتھ ساتھ اسے عملی جامہ پہنانے کی تجویز سوچی۔ روپے پیسے کا مسئلہ تو کوئی مشکل نہ تھا۔ حضرت مولانا داؤد غزنوی اور مولانا محی الدین احمد قصوری رحمہا اللہ نے ذاتی طور پر دلچسپی لیتے ہوئے اہتمام وانتظام میں ہماری اچھی خاصی رہنمائی فرمائی، اور مدعوئین کی فہرست مرتب کرنے میں خاص دلچسپی لی تاکہ کوئی قابل ذکر شخصیت رہ نہ جائے۔ ہمارے خصوصی مہمان مولانا ابوالحسن علی ندوی بروقت تشریف لائے۔ عصرانہ بہت پر تکلف تھا۔ دیر تک کھانے پینے کے مشغلہ کے

ساتھ تعارف اور باہمی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ ابوالحسن علی ندوی صاحب جب رشید اختر ندوی سے ملے تو کہنے لگے "آپ میری شناخت کی داد دیجیے کہ مدت کے بعد آپ کو دیکھا ہے اور میں نے فوراً پہچان لیا ہے۔" حضرت مولانا سید داؤد غزنوی کی تعارفی تقریر کے بعد جناب ابوالحسن علی ندوی نے مؤثر اور فاضلانہ تقریر شروع کی۔ پُر مغز تقریر کے دوران میں انہوں نے برِّصغیر پاک و ہند میں قرآن وحدیث کی تعلیم اور اہلحدیث جماعت کے کارہائے نمایاں پر تفصیلاً روشنی ڈالی۔ تقریر اس قدر پر تاثیر تھی کہ مولانا محی الدین قصوری آبدیدہ ہو گئے۔ واقعی ان حضرات کو اللہ تعالٰی نے رقت اور اثر پذیری کی لازوال دولت سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔ بالآخر مولانا قصوری صاحب کے اظہار تشکر پر یہ محفل بخیر وخوبی انجام پذیر ہوئی۔

سال کے اختتام پر مرکزی جمعیت کے تحت اکثر وبیشتر مدارس میں ایک امتحان شروع ہوا۔ مدرسہ تقویۃ الاسلام کا وسیع وعریض ہال امتحان گاہ قرار پایا۔ امتحان کی نگرانی مولانا قصوری صاحب کے ذمہ تھی۔ انہوں نے بڑی تندہی سے اس فرض منصبی کو انجام دیا۔ چونکہ بیرونی مدارس کے طلباء بھی اس امتحان میں کثرت سے شامل ہوتے تھے اس لیے قیام و طعام کے علاوہ امتحانی ضروریات مہیا کرنا اور تمام انتظامات کی دیکھ بھال انہی کے سپرد تھی۔ مولانا صبح کو آتے اور شام کو واپس لوٹتے۔ شب وروز کی یہ گوناگوں مصروفیات ان کے لئے بڑی صبر آزما تھیں۔ سب چیزیں ان کے جذبۂ اخلاص کی دلالت کرتی ہیں۔ ہمارا امتحان ہر لحاظ سے بڑے حسن وخوبی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ کسی طرف سے کسی قسم کی کوئی گڑبڑ اور انتظام وانصرام میں کوئی خلل واقع نہ ہونے پایا۔

خدا کے فضل سے اتنے اچھے امتحانات ہوئے کہ سب سے زیادہ نمبر میں نے ہی حاصل کیے۔ بخاری شریف کا پرچہ کراچی سے مولانا شرف الدّین (مرحوم) نے

مرتب کیا تھا۔ مضمون نگاری اور ترجمتین کا پرچہ خود مولانا قصوری صاحب نے مرتب کیا تھا۔ اس پرچہ کے امتحان کے دن ہمارے لیے کوئی نگران بھی مقرر نہیں کیا گیا تھا۔

خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوا تو نتیجہ شائع ہونے سے قبل ہی مولانا نے ایک دن اپنی کوٹھی پر ہماری دعوت کی۔ ایک خوشگوار شام کو ہم دعوت سے لطف اندوز ہونے کے لیے نکلے۔ سالار کارواں کے طور پر مولانا شریف اللہ صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ یہ دعوت اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتی تھی کہ ساری چیزیں مولانا نے گھر پر ہی تیار کروائی تھیں۔ متعدد قسم کے کھانے اور مٹھائیاں بڑے اخلاص سے پیش کی گئیں۔ حقیقت میں یہ دعوت بہت مرغوب اور پر تکلف تھی۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر ہم صوفے پر ٹیک لگائے اطمینان سے بیٹھے ہی تھے کہ مولانا نے ہم سب کے سامنے جھٹ سے ایک نیا سوال رکھ دیا کہ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ کا محبوب مشغلہ کیا ہوگا اور آپ کیا بننا پسند کریں گے؟ جواب میں قاضی محمد اسلم صاحب نے کہا 'میں کسی ماہنامہ کا ایڈیٹر بننا چاہتا ہوں۔' غلام نبی صاحب نے کہا 'میں چاہتا ہوں، میرے سامنے ہر وقت کاغذ اور قلم موجود ہو اور میں اس پر لکھتا ہی رہوں'، یعنی وہ ایک مصنف بننا چاہتے تھے۔ اسی طرح حافظ عزیز الرحمن صاحب نے مدرس بننے اور دوسروں نے کچھ بننے کا خیال ظاہر کیا۔ لیکن یہی سوال جب مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے کہا میں ایک پروفیسر بننا چاہتا ہوں۔ میرا یہ جواب سن کر غالباً اس وقت سب نے یہ سمجھا ہوگا کہ یہ خیالی پلاؤ ہے مگر خداوند کریم کی عجب شان دیکھیے کہ اس نے میری تمنا پوری فرمائی۔ واقعی اللہ رب العزت پر توکل کرتے ہوئے انسان اگر نیک نیتی و تندہی کے ساتھ اپنے مقصدِ حیات کے حصول کے لئے تگ ودو کرے اور تمام مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی مشکل کشائی

فرما دیتے ہیں اس کی دیرینہ تمنا کو برلاتے ہوئے روز افزوں ترقیوں کی شاہراہ کی طرف اسے رواں دواں اور گامزن کر دیتے ہیں۔

میں ذکر یہ کر رہا تھا کہ میری زندگی کو سنوارنے میں میرے مشفق و بزرگوار مولانا قصوری صاحب (مرحوم) کی نوازشات نے کچھ ایسا کردار ادا کیا ہے جسے میں کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ غالباً 1957ء کے اوائل میں گوجرانوالہ میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس تقریب میں محترم المقام علامہ شیخ خلیل بن محمد عرب (م26اگست 1966ء) تشریف لائے تھے۔ قابل قدر باپ کی قابل قدر بیٹی محترمہ عطیہ بیگم بھی اپنے والد بزرگوار کی معیت میں تشریف لائیں۔ عطیہ بنت خلیل عرب، خواتین کی کانفرنس میں کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوئیں۔ میں اس کانفرنس میں شرکت سے محروم رہا کیونکہ ان دنوں اپنے مشفق استاد حضرت مولانا داؤد غزنوی ؒ سے اجازت لے کر اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے دہلی چلا گیا تھا۔ جب واپس لوٹا تو کانفرنس ختم ہو چکی تھی اور کراچی کے دونوں معزز مہمان بھی واپس جا چکے تھے۔ ادھر میں بھی کفِ افسوس ملتا رہا کہ ملاقات سے محروم رہا۔ اس حرماں نصیبی کی تلافی کی خاطر میں نے عطیہ بیگم صاحبہ کو خط لکھا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ مولانا قصوری مرحوم کی بے حد مداح تھیں۔ ایک دفعہ میں مولانا صاحب کے گھر میں حاضر ہوا تو کیا دیکھا کہ وہ عطیہ بیگم کی تحریر کردہ ایک کتاب کا مسودہ دیکھ رہے ہیں۔ غالباً اس کتاب کا نام "محسن انسانیت" تھا۔ باتوں میں ہی میں نے مولانا سے ذکر کیا کہ محترمہ عطیہ بیگم کو خط لکھا مگر انہوں نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ بس اتنا ہی کہنا تھا کہ مولانا نے اسی نشست میں قلم اٹھایا اور انہیں خط لکھ دیا اس خط کے ذریعے سے مجھے جواب دینے کے لئے سفارش تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد مجھے اوکاڑہ کے پتہ پر محترمہ عطیہ بیگم کی طرف سے

جواب مل گیا۔ خط میں انہوں نے علمی رسوخ اور اتقان پیدا کرنے کی تلقین کی۔ اس کے بعد پھر خط و کتابت منقطع ہو گئی۔ اس انقطاع میں میرا ہی قصور ہے۔ محترمہ عطیہ بیگم سے اس وقت تک مجھے ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا لیکن خدا کا کرشمہ دیکھئے کہ حرماں نصیبی بھی زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہوئی۔

1960ء میں میں اورینٹل کالج کا طالب علم تھا۔ ایک دن ایم۔ اے کی کلاس ختم ہوتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ علمی مذاکرات کے سلسلہ میں چند حضرات کی جماعت آدھمکی، جماعت میں جہاں مولانا محی الدین قصوری صاحب اور مولانا طاہر سورتی وغیرہ شامل تھے وہاں ایک برقع پوش خاتون بھی تھیں۔ میں پہلے نہیں جانتا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہی برقع پوش خاتون محترمہ عطیہ بیگم تھیں۔

جامعہ سلفیہ لاہور میں ہمارے امتحان کا نتیجہ آنے کے بعد چھٹیاں شروع ہو گئیں کیونکہ رمضان کی بھی آمد آمد تھی۔ جامعہ سلفیہ سے وظیفہ ہی نہیں کھانا بھی بند ہو گیا۔ اس میں انتظامیہ حق بجانب ہی تھی کیونکہ قیام و طعام کی سہولتوں اور وظیفے کا اجراء تو اس لیے تھا کہ طلبہ کی تمام تر توجہ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر رہے، چنانچہ حضرت مولانا داؤد غزنوی مرحوم نے بڑی زیرکی سے اپنے خانساماں محمد عمر کشمیری کے ذریعہ میرے میٹرک کے امتحان کے بارے میں ٹوہ لگوائی اور برسر مجلس میری سرزنش کی، اس پشیمانی پر میری حالت دیدنی تھی۔

میرا اپنا نظریہ تھا کہ یہ تعلیم کوئی خالص قرآن و حدیث کی تعلیم نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہدیہ سعدیہ، ہدایت الحکمت، میبذی ملا حسن، حمد اللہ جیسی یونانی خرافات کی بحث میں لازمی طور پر الجھا دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں علوم عربیہ کے امتحانات، شاندار نتیجے اور کارِ منصبی کی ادائیگی سے سبکدوش ہونے کے بعد فرصت کے لمحات میں

اگر کوئی علومِ حاضرہ سے روشناس ہو جائے تو اس میں کیا قباحت ہے؟ قباحت تو صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے جب کہ انسان انگریزی سے تھوڑا بہت شناسا ہوتے ہی دینِ اسلام کی حقیقی روح سے یکسر بیگانہ ہو جائے اور اپنے اسلاف کے طریق کار اور لائحہ عمل سے برگشتہ ہو کر کوسوں دور ہٹ جائے۔ جبکہ اس کی نگاہیں مغربی تہذیب و ثقافت، شان و شوکت اور جاہ و حشمت کے سامنے خیرہ ہو کر رہ جائیں اور اس کی زندگی کا تعمیری پہلو مادیت کی رو میں بہہ کر سراسر تخریب میں ڈوب جائے۔ لیکن یہاں معاملہ تو کچھ اور ہی تھا، میری نیت میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں تھی، میں تو یہ چاہتا تھا کہ علوم شرقیہ کے ساتھ ساتھ علوم غربیہ کا بھی کچھ باہمی میل جول اور حسین امتزاج ہو جائے۔ خصوصاً مادیت، الحاد اور لادینی کے اس پر آشوب دور میں دینی تبلیغ کے لئے جدید نظریات سے واقفیت از حد ضروری ہے۔ مگر زمانہ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ کس طرح کروٹیں بدلتا ہے کہ آج جامعات میں ہی انگریزی سکھانے کے لئے بڑی ہمت افزائی کی جاتی ہے لیکن ان دنوں اگر کوئی نجی طور پر بھی انگریزی پڑھتا تو اس کا قافیہ تنگ کر دیا جاتا تھا۔ میں اپنے موضوع سے کچھ دور چلا گیا جس کی معذرت چاہتا ہوں۔

ہاں تو یہ وظیفہ بند ہو جانے سے میرے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ اسی پریشانی اور افسردگی کے دنوں میں ایک روز مولانا محی الدین قصوری میرے سامنے صبحِ امید بن کر نمودار ہوئے۔ انہوں نے اپنی کوٹھی پر مجھے رہائش اور طعام وغیرہ کی پیش کش کی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ مجھے اس وقت اور کیا چاہئے تھا؟ میں نے فوراً اس پیشکش کو شکریے کے ساتھ قبول کر لیا اور بصد مسرّت و شادمانی اُن کے گھر جانے کو تیار ہو گیا۔ مولانا نے تانگہ کا کرایہ بھی مجھے اپنی جیب سے دیا۔ تانگہ میں اپنا سامان اور ضروریات کی دوسری چیزیں رکھ کر میں اُن کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ یہ کوٹھی مزنگ روڈ پر

واقع تھی۔ مولانا کے تعمیل ارشاد میں جوں ہی میں وہاں پہنچا تو انہوں نے میری رہائش کے لئے اپنا ریڈنگ روم خالی کروادیا۔ جب رات آئی تو اپنے مکان کے کشادہ برآمدہ میں مولانا نے اپنے پاس ہی میرے لیے ایک الگ چارپائی بچھوادی، وہیں میں روزانہ لیٹ جایا کرتا تھا مولانا بھی میرے قریب اسی کھلے برآمدہ میں سو جایا کرتے تھے۔

یہاں آکر میں ایک اور ہی دنیا میں بسنے لگا چونکہ یہ پورا علاقہ رہائش کے لئے مخصوص تھا۔ اس لیے شہر کے شور وغل سے بہت دور تھا۔ جہاں چاروں طرف سے مکمل سکوت چھایا ہوتا تھا۔ یہاں میرا اوڑھنا بچھونا اور کھانا پینا سب مولانا کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ پو پھٹتی تو مجھے جگاتے اور ہم دونوں مل کر نماز فجر ادا کرتے، امامت کے لئے کبھی وہ مجھے حکم دیتے اور کبھی خود ہی امامت کا کام سرانجام دیتے۔ نماز میں تلاوت قرآن کرتے تو بے اختیار ان کی آنکھیں اشکبار اور آواز گلوگیر ہو جاتی۔ نماز کے بعد ہم دونوں سیر کو نکل جایا کرتے تھے۔ عموماً باغ جناح جو تقسیم سے قبل لارنس گارڈن کے نام سے موسوم تھا، ہماری سیر کی آخری منزل ہوا کرتا تھا۔ ان باغات میں کہیں تو رسدگاہوں یامعائنہ گاہوں (Observatory) کے نشانات ملتے ہیں اور کہیں اونچی اونچی مصنوعی پہاڑیاں اور ان پہاڑیوں کے درمیان کے نشیب وفراز اور پیچ و خم کو دیکھ کر طبیعتیں محظوظ ہوا کرتی تھیں۔ جابجا درختوں کے جھنڈ ایسے بھی تھے کہ باہر سے دیکھیے تو درخت ہی درخت ہیں اور اندر جایئے تو اچھی خاصی جگہ ہے۔ اور کہیں کہیں بنچیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو کر ایسے گنجان جھنڈ کے کسی گوشہ میں بیٹھ جانا اور مطالعہ کتب میں غرق ہونا کتنی اچھی بات ہے!

غالباً رسدگاہ کے قریب جو فوارہ تھا اس میں رات کے وقت مختلف رنگوں کی روشنی اس اہتمام وانتظام سے پیوست کی گئی تھی کہ گویا قوس وقزح محلول ہو کر برسنے

لگی ہے یا جل پریوں نے قبائے طاؤسی زیب تن کر کے رقص شروع کر دیا ہے۔ عجب پُر کیف اور نشاط آفریں منظر تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ حافظ کی غزلوں اور خیام کی رباعیات نے مجسم ہو کر فضا کو ہمہ نغمہ و شعر اور ایک پیکر نزہت و لطافت بنا دیا ہے۔ مصنوعی پہاڑیوں کے اوپر جہاں درختوں کے جھنڈ تھے وہاں بیٹھنے کے لئے بنچیں بنی ہوئی تھیں۔ جہاں بیٹھ کر لوگ عموماً گپ شپ کیا کرتے تھے۔ ہر سمت بڑی رونق اور چہل پہل تھی اور یہ مناظر بڑے جاذبِ نظر اور دل کش تھے کہ خدا کی قدرت کے سامنے سر بسجود ہو جانے کو جی چاہتا تھا۔

اللہ ! اللہ ! صبح کے دھندلکے میں جناح باغ کے سبزہ زاروں پر جب شبنم کے موتی بکھرے پڑے ہوتے تھے تو یہ ایک معمورہ نشاط و انبساط کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ اس وقت یہاں رنگ و نور کا ایک عجب سماں پیدا ہوتا تھا۔ اسی باغ جناح کے ایک گوشہ میں سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ جہاں بیٹھ کر مولانا محی الدین احمد قصوری ہر اتوار کو بعد از نماز عصر پوری پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ قرآن مجید کا درس دیا کرتے تھے۔ مولانا کے پر کشش درسِ قرآن میں علمی و فکری دلائل کے علاوہ دیگر مباحث بھی ضمناً زیر بحث آ جاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہر کے گوشے گوشے اور چپے چپے سے فہمیدہ اور سنجیدہ اصحاب اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اچھی خاصی تعداد میں درس سننے کے لئے کشاں کشاں چلا آتا تھا۔ درس دیتے ہوئے مغرب کا وقت ہو جاتا تو نماز میں کبھی مولانا خود اور کبھی کوئی دوسرے صاحب امامت کا فریضہ انجام دیتے۔

ان دنوں درس گاہ کے نیچے فرش بچھا ہوا اور اوپر آسمان سایہ فگن تھا۔ سردی ہو یا گرمی، دھوپ ہو یا بارش سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ درس قرآن کے باقاعدہ سامعین میں دو آدمی بڑے ذوق و شوق سے شامل ہوتے تھے۔ افسوس کہ دونوں کے

نام اب میرے ذہن سے اتر گئے۔ دونوں اسلامیات میں ایم۔اے کئے ہوئے تھے ان میں سے ایک تو خود مولانا کے داماد تھے۔ صرف میں ہی ایک نادان تھا کہ باقاعدہ اس درس میں حاضر نہیں ہوا کرتا تھا۔ اب اپنی اس کوتاہی پر غور کرتے ہوئے کفِ افسوس ملنے کے علاوہ کوئی اور چارۂ کار نہیں۔

مولانا نے یہ تبلیغی خدمت 1956ء کے ماہِ جنوری سے انجام دینا شروع کی۔ قبل ازیں آپ کے برادر عزیز مولانا محمد علی قصوری ایم۔اے کینٹب (م1956ء) تقریباً چھ سال تک یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ اب تو ماشاءاللہ باغ جناح کی اس کھلی درس گاہ میں ایک نہایت ہی حسین و جمیل مسجد تعمیر ہو چکی ہے۔ تقریباً چار سال تک مسلسل مولانا محی الدّین درس دیتے رہے۔ 1963ء سے قبل ہی مولانا کی طبیعت ناساز رہنے لگی اور آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اختلاجِ قلب نے شدید صورت اختیار کر لی۔ بناء بریں اس درس قرآن کا بابرکت سلسلہ یک لخت بند ہو گیا۔ بعد میں البتہ حافظ احمد یار صاحب (شعبہ اسلامیات، پنجاب یونیورسٹی) نے درس قرآن کی بے لوث خدمت اپنے ذمہ لے لی۔ حافظ موصوف بڑے ہی ملنسار اور بلند پایہ شخصیت تھے۔ مشرقی پاکستان چلے آنے کے بعد بھی ان کے ساتھ میری خط و کتابت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔

مولانا محی الدین احمد قصوری درس قرآن کے لیے عموماً مولانا ابوالکلام آزاد کے ''ترجمان القرآن'' کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ کبھی کبھار ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے صفحات میں بھی اُن کے درس قرآن کا خلاصہ شائع ہوتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولوی فاضل کے امتحان کی تقریب پر، میں اور میرے دوست مولوی قدرت اللہ فوق مغرب کی نماز کے بعد لالٹین لے کر وہاں پڑھنے گئے تھے۔ ہم کچھ پڑھنے نہ پائے تھے کہ کئی آدمیوں نے آکر ہماری مزاحمت کی اور فوراً

کہنے لگے کہ لالٹین کو گل کر دو کیونکہ اس سے بہتوں کی خلوت میں خلل اندازی ہوتی ہے چنانچہ ہمیں نامراد گھر آنا پڑا۔

اس سے پہلے میں بتا چکا ہوں کہ مولانا قصوری مرحوم کی کوٹھی میں چلے آنے کے فوراً بعد ہی ماہ رمضان کی آمد آمد تھی اس بابرکت مہینہ میں مولانا بڑی دیر تک قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے، نہ جانے کتنی بار قرآن پاک ختم کرتے۔ علی الصبح تو ہم باغ جناح کی سیر کو نکل جایا کرتے اور مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد کھانا کھا کر تراویح پڑھنے کو چلے جاتے، یہ تراویح ہم آس پاس کی مسجدوں میں نہیں پڑھتے تھے بلکہ ایک ڈیڑھ میل کی مسافت پیادہ طے کرتے ہوئے شیش محل روڈ پر واقع مدرسہ تقویۃ الاسلام کے وسیع و عریض ہال میں جایا کرتے تھے، جہاں نماز تراویح کی بڑی جماعت ہوتی۔ مستورات کے لیے پردے کا انتظام تھا۔ حافظ عبدالرشید کو ہڑوی تراویح کی نماز پڑھاتے۔

گاہے بگاہے فرصت کے لمحات میں مولانا مجھے انگریزی پڑھایا کرتے۔ انگریزی زبان پر انہیں کافی دستگاہ حاصل تھی۔ لاہور سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامے کے ایڈیٹر کی ڈاک میں کبھی کبھی اُن کے خطوط شائع ہوتے لیکن ان خطوط کے آخر میں آپ کا نام اس طرح درج ہوتا کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا۔ کیونکہ پورے نام کے بجائے صرف ''مسٹر قریشی'' پر اکتفا کرتے۔ ویسے کسی اور موقع پر مولانا کو ان کے نام کے آخر میں قریشی کا لفظ لکھتے نہیں دیکھا گیا۔ غالباً یہ اُن کی انکساری اور کمال فروتنی کی علامت ہے۔ البتہ اُن کے صاحبزادگان اپنے اپنے نام کے ساتھ قریشی کا لفظ بالالتزام لکھا کرتے تھے۔ میری یادداشت ایسی کمزور واقع ہوئی کہ اُن کے بڑے صاحبزادے (معین قریشی) کا نام بھول جاتا ہوں جو ان دنوں غیر ملک سے ڈگری

حاصل کر کے ایک غیر ملکی خاتون سے شادی کر چکے تھے۔ ان کے دو چھوٹے بھائی سلمان قریشی اور بلال قریشی تھے۔ مولانا کے نواسوں میں سے صرف عامر و صہیب کے نام مجھے یاد ہیں۔

زمانہ اسی طرح دبے پاؤں گزرتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رمضان المبارک کا مہینہ بھی ختم ہوا۔ عید کی خوشی میں اس کی بابرکت اور سنہری صبح کو مولانا نے مجھے بہترین جوڑے عطا فرمائے۔ قمیص کے کپڑے میں جو خوبصورت سی دھاریاں (Stripes) تھیں، وہ اب بھی مجھے یاد ہیں۔ عید الفطر کی نماز پڑھ کر جب ہم واپس لوٹے تو گھر میں آکر طرح طرح کے پر تکلف کھانے کھائے۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے قیلولہ کرنے کے بعد ہم نے ظہر کی نماز پڑھی۔ سہ پہر کے وقت مولانا مجھے ساتھ لے کر تار گھر کی طرف چلے اور عید کی خوشیوں میں شریک کرنے کے لئے محترمہ عطیہ بیگم اور دوسروں کو تار بھیجا۔ شام کے لگ بھگ واپس آئے تو کیا دیکھا کہ مولانا عبدالرحمن صاحب طاہر سورتی اپنی فیملی لے کر ملنے کو آئے ہوئے ہیں۔ ان کے بچوں کو عیدی دی گئی اور وہ شام کے جھٹپٹے میں تشریف لے گئے۔

چند دنوں کے بعد میرا میٹرک کا امتحان شروع ہو گیا۔ شیرانوالہ دروازہ کے ہائی سکول میں میرا اسنٹر تھا۔ سکول کے پاس ہی شیرانوالہ مسجد ہے جہاں حضرت مولانا احمد علی (مرحوم) درس قرآن دیا کرتے تھے۔ میرا میٹرک کے امتحان میں بیٹھنا اور اس میں شاندار طور پر کامیاب ہونے کا راز مولانا قصوری مرحوم کے تعاون اور حوصلہ افزائی میں مضمر ہے۔ امتحان ختم ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد اوکاڑہ سے یونس صاحب کا ایک خط آیا کہ بامہ بالا ہائی سکول میں عربی ٹیچر کی ایک آسامی خالی ہے۔ مولانا قصوری مرحوم نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لے چنانچہ انہوں نے اپنے

ہاتھ سے درخواست لکھ کر ٹائپ کروائی اور پھر یامہ بالا ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر چودھری عبدالمجید صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی کے نام بھیج دی۔ درخواست کی دوسری کاپی آپ نے اوکاڑہ شہر میں برلا ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر جناب عبدالحکیم صاحب کے نام بھیجنے کو کہا۔ ہر چند میری دلی تمنا تھی کہ میری تقرری کسی نہ کسی طرح برلا ہائی سکول ہی میں ہو جائے کیونکہ میری ساس اور ہم زلف وغیرہ یہیں رہا کرتے تھے۔ مزید برآں جامعہ محمدیہ اوکاڑہ سے فارغ التحصیل ہونے کے باعث اس جگہ سے میں یک گونہ مانوس بھی تھا لیکن مشیت ایزدی یہ نہ تھی کہ یہاں میری تقرری ہوتی اور ہوتی بھی کیونکر

یرید المرء ان یوتی مناہ
ویابی اللہ الا مایشاء
ماکل ما یتمنی المرء یدرکہ
تجری الریاح بما لا تشتھی السفن

ترجمہ: ”انسان یہی چاہتا ہے کہ اس کی تمنائیں برآئیں مگر خدا اپنی مشیت کے مطابق سب کچھ کر جاتا ہے۔ آدمی کی تمام آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں اور نہ ہی ہمیشہ کشتیوں کے موافق ہوائیں چلتی ہیں۔“

چنانچہ پورا ایک ماہ گزر جانے کے بعد بجائے برلا ہائی سکول کے یامہ بالا میں زندگی کی پہلی ملازمت کا آغاز کرنے کے لیے جب میں لاہور سے روانہ ہوا تو وہ واقعی ایک یادگار صبح تھی۔ مولانا نے دعائے خیر کے ساتھ مجھے خدا حافظ کہا۔ اس وقت ان کی آواز بھرائی ہوئی اور آنکھیں اشکبار تھیں، یہ یادگار منظر ایسا تھا کہ تادم زندگی میں اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ مہینہ اور تاریخ مجھے یاد نہیں لیکن وہ روح پرور صبح تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے اور چاروں طرف ہوا کی میٹھی میٹھی خوشبو رچی بسی تھی۔

بھینی بھینی خوشبو نے تو کئی بار اس سے پہلے بھی مشام جان کو معطر کیا تھا مگر میٹھی خوشبو کا احساس پہلی دفعہ ہوا تھا۔ مٹھاس کی یقیناً ایک خوشبو ہے جبھی تو میٹھا بول سن کر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو کیفیت ان قدموں کی آہٹ میں ہوتی ہے، جن سے کلیاں کھل جاتی ہیں اور پھول مسکرانے لگتے ہیں۔

بامہ بالا ضلع منٹگمری (ساہیوال) تحصیل اوکاڑہ کی ایک پس ماندہ، دور افتادہ مگر حسین بستی ہے۔ اس حسین بستی کے ایک پہلو میں ہائی سکول کی نئی عمارت زیر تعمیر ہے اور عمارت کے چاروں طرف کھلے میدان ہیں۔ نیز کیکر کے جھنڈ اور لمبی لمبی قطاریں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بس کے راستہ سے بھائی پھیرو اور رینالہ خورد سے بس تبدیل کرنا پڑتی ہے کیونکہ آگے کی سڑک بالکل ہی کچی ہے جس پر مشکل سے ہی بس چلتی ہے۔ یہاں انتظار کی گھڑیاں گزار کر جب بمشکل بس پر بیٹھا تو دن ڈھل چکا تھا۔ دن بھر اک تھکا ہارا آفتابِ مغرب کے افق سے اپنی ہلکی پھلکی اور میٹھی میٹھی شعاعیں چاروں طرف بکھیر رہا تھا۔ شہری علاقہ کو خیر باد کہہ کر پہلی بار دور دراز گاؤں کا حسین و جمیل اور دلکش منظر دیکھ کر طبیعت بہت محظوظ ہوئی۔ اس دلفریب منظر نے میرے دل میں ایک عجیب کیف و سرور پیدا کر دیا۔ ویسے اس گاؤں کے لئے ذہن نے پہلے سے ہی خیالی تصور کا ایک خاکہ کھینچ لیا تھا۔

بہر کیف جب خدا خدا کر کے بامہ بالا پہنچا تو وہاں کے ماسٹر عبدالرزاق صاحب لاشاری، انور صاحب اور سکول کے دیگر اسٹاف نے بڑے خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ میری آؤ بھگت کی۔ انور صاحب دراصل کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ خاکسار پارٹی کے ساتھ وہ پنجاب آ گئے تھے۔ بالآخر بامہ بالا میں ہی سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں آ کر سب سے پہلے تو میں ان کے ہاں ٹھہرا لیکن بعد میں پھر ماسٹر عبدالرزاق صاحب لاشاری

کے ہاں چلا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بامہ بالا پہنچ کر وہاں کے ہائی سکول میں ملازمت شروع کرنے کے بعد میری زندگی کا ایک نیا دور تھا۔

ابھی بامہ بالا پہنچے مجھے پورا ایک ماہ بھی ہونے نہیں پایا تھا کہ ایک دن اچانک مولانا قصوری صاحب کی طرف سے ضروری تار وصول ہوا۔ اس تار کے ذریعہ مولانا نے دراصل مجھے میٹرک کے نتیجہ کی اطلاع دی تھی اور میری شاندار کامیابی کے بعد مجھے دلی مبارک باد دی تھی۔ اس کامرانی پر میری ہمت بتدریج بڑھتی گئی۔

اس روز افزوں حوصلہ افزائی میں جس طرح مولانا قصوری صاحب نے حصہ لیا ٹھیک اسی طرح بامہ بالا ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر چودھری عبدالحمید صاحب نے بھی ہمیشہ میری معاونت کی۔ چنانچہ ملازمت کے دوران فرصت کے اوقات میں میں نے ایف۔ اے کی تیاری شروع کر دی۔

اسی دوران تعطیلات گرما میں مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک بار رومانوں کی سرزمین مشرقی پاکستان کا چکر لگا کر آ جاؤں، اگرچہ ہیڈ ماسٹر عبدالحمید صاحب نے ہر چند مزاحمت کی اور بادی النظر میں بھی یہ بات ناممکن سی نظر آ رہی تھی تاہم یہ صرف مولانا قصوری کا ہی تعاون تھا جس نے میرے لئے مشرقی پاکستان جانے کی راہ ایک حد تک ہموار کر دی۔ چنانچہ بامہ بالا سے مزنگ روڈ لاہور پہنچ کر انہیں اپنا دکھڑا سنایا تو کہنے لگے 'بھئی مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس اتنی رقم بھی نہیں کہ تمہیں مشرقی پاکستان کا کرایہ ہی دے دوں البتہ چوک انار کلی میں حبیب بینک کی جو شاخ ہے، اس کے اکاؤنٹ میں میرے ساٹھ روپے پس انداز ہیں، یہی ہے جو میں تمہیں دے سکتا ہوں اور یہ بطور قرض حسنہ نہیں بلکہ ہدیہ ہیں۔' چنانچہ میں ان کے ہاں ٹھہرا اور صبح دس بجے حبیب بینک جا کر ساٹھ روپے کے چیک کو کیش کروایا۔ پھر مولانا سے رخصت ہو کر اسی

روز تیز گام سے کراچی پہنچا۔ کراچی سے پھر بذریعہ بحری جہاز مشرقی پاکستان روانہ ہو گیا۔

چوہدری عبدالحمید صاحب کے بعد بامہ بالا میں محمد صدیق نامی جب دوسرے ہیڈ ماسٹر آئے تو وہ مارے حسد کے میرے امتحان اور اس میں کامرانی کو بری نگاہ سے دیکھنے لگے۔ مزید برآں میرے بی۔اے کا نتیجہ شائع ہونے کی راہ میں انہوں نے روڑے بھی اٹکائے۔ اس بدسلوکی اور گھناؤنے برتاؤ سے دل شکستہ و دل برداشتہ ہو کر ہائی سکول کی ملازمت کو لات مار کر میں لاہور آ گیا۔

یہاں آتے ہی حضرت حافظ عبدالقادر روپڑی نے از راہِ کرم مجھے جامعہ قدس چوک دالگراں لاہور میں معقول تنخواہ پر مدرس رکھ لیا۔ یہاں آ کر بہت سی کتابوں کے مطالعے کا موقعہ ملا۔ پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج میں میں ایم۔اے کا طالب علم بھی تھا۔ یہ داخلہ اسلامیہ کالج سول لائن کی وساطت سے لیا۔ اس طرح مجھے ڈبل فیس ادا کرنا پڑتی تھی چنانچہ فیس معافی کے سلسلہ میں مولانا نے میرے لئے بڑی کوشش کی۔ کبھی تو وہ مجھے اورینٹل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سید عبداللہ کے پاس لے گئے، کبھی انجمنِ حمایتِ اسلام کے صدر جناب محی الدین کے پاس اور کبھی ایم۔اے۔او کالج کے پروفیسر منور صاحب کے پاس مگر میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اب میں چاہتا ہوں کہ مولانا محی الدین احمد قصوری مرحوم کی حیات مستعار کے کچھ حالات اور جستہ جستہ واقعات بھی قلم بند کر دوں۔ مولانا محی الدین احمد قصوری مرحوم کے والد بزرگوار جناب مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم بڑی مشہور و معروف شخصیت تھے۔ 1920ء کے لگ بھگ وہ مجلسِ خلافت پنجاب کے صدر اور قومی تحریک کے بڑے ستون تھے۔

اس زمانہ میں اس خاندان نے کئی لحاظ سے بڑا نام پیدا کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ بھی پورے خاندان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ ایک دفعہ حج کو گئے تو مولانا آزاد نے متعدد خطوط لکھے۔ مولانا عبدالقادر کا آبائی وطن تو دلاور چیمہ گوجرانوالہ ہے مگر بعد میں دلاور چیمہ کو خیر باد کہہ کر انہوں نے قصور کو مستقل طور پر اپنا وطن قرار دے لیا تھا۔ اسی نسبت سے سارا خاندان قصوری کہلانے لگا۔ گویا یہ لفظ پورے خاندان کے ساتھ جزو لانیفک ہو کر رہ گیا ہے۔

علاقہ پنجاب میں قصور ایک پرانا مردم خیز خطہ اور تاریخی اہمیت کا حامل شہر ہے۔ یہ شہر بھارت کی سرحد سے دور نہیں ہے۔ یہ ضلع لاہور کی تحصیل ہے اور اب قصور خود ضلع بن چکا ہے۔ مجھے بھی ایک دفعہ قصور جانے کا اتفاق ہوا، وہ اس طرح کہ قصور میں ان دنوں ایک کالج کھولا گیا تھا۔ باتوں باتوں میں ایک دن مولانا محی الدین قصوری مرحوم مجھے کہنے لگے کہ کارکنانِ کالج میرے بہت متعارف ہیں اگر وہاں شعبۂ عربی کھولا گیا، تو میں تمہیں وہاں لیکچرار لگا سکوں گا، تمہارے پاس البتہ ایم۔اے کی ڈگری نہیں ہے مگر اس میں کیا حرج ہے! انگریزی تو تم پڑھ ہی رہے ہو اور مولوی فاضل جیسی چوٹی کی ڈگری تمہارے پاس ہے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے ایک صاحب کے نام خط لکھ دیا جسے لے کر میں قصور پہنچا۔ اور بڑی دقت سے مجھے مکتوب الیہ کا گھر معلوم ہوا۔ مگر کام کچھ نہیں بنا۔ مجبوراً الٹے پاؤں واپس آنا پڑا۔

یہی وہ قصور شہر ہے جہاں مولانا محی الدین احمد بی۔اے مرحوم نے کتم عدم سے وادئ وجود میں قدم رکھا اور قصوری خاندان کے شریف ترین گھرانے اور علمی ماحول میں آنکھ کھولی۔ پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ مولانا کی دینی تعلیم کی ابتداء اپنے والد ماجد مولانا عبدالقادر صاحب قصوریؒ کے ہاتھوں ہوئی۔ پھر مولانا فضل حق

صاحب، مولانا اسماعیل دلاوری صاحب اور مولانا عبدالرحمن صاحب جیسی بزرگ ہستیاں اُن کی اتالیق مقرر کی گئیں جن سے اُنہوں نے ترجمۂ قرآن اور عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ درس نظامی کے مطابق دیگر کتابیں بھی پڑھیں۔ دینیات کی تعلیم ختم کر کے غالباً صور ہائی سکول سے ہی اُنہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر ایف۔ اے اور بی۔ اے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ 1911ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انہوں نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ کالج کے انگریز اساتذہ میں سے مسٹر رابسن کا نام وہ زیادہ لیتے تھے۔ مرکزی جمعیت اہلحدیث کی زیر نگرانی جملہ مدراس عربیہ کا سالانہ امتحان جب تقویۃ الاسلام کے وسیع ہال میں شروع ہوا تو مولانا نے امتحان کی ہدایات و تنبیہات کے طور پر تقریر فرمائی۔ پھر ایک مثال پیش کرتے ہوئے دورانِ تقریر فرمایا کہ ہمارے گورنمنٹ کالج لاہور کے ٹیچر مسٹر رابسن اکثر اوقات انگریزی کی مشہور کہاوت زبان پر لاتے تھے:

Brevity is the soul of wit. (اختصار عقل مندی کی روح ہے)۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم کے دوران میں مولانا کی رہائش ہوسٹل میں ہوا کرتی تھی۔ ہوسٹل کے بالمقابل تالاب تھا جس میں نہایا کرتے تھے۔ گاہے گاہے خلوت میں بیٹھ کر اپنے دوستوں اور ہم نشینوں کے ساتھ ملک کی آزادی کے لئے تراکیب سوچتے۔ مولانا نے مجھے ہوسٹل کی زندگی کے ایسے بیسیوں واقعات سنائے جنہیں میں کسی اور وقت پر اٹھا رکھتا ہوں۔

قصوری خاندان کے مختلف افراد خصوصاً حضرات مولانا عبدالقادر صاحبؒ اور ان کے دو بیٹے مولانا محی الدین احمد قصوری اور مولانا محمد علی ایم۔اے کینٹب قصوری

انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کی منظم تحریکات میں بہت پیش پیش تھے۔ چھوٹے بھائی مولانا محمد علی قصوری 1914ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے ایم۔اے(ریاضی) میں اوّل آئے۔ اور جب وطن واپس آنے لگے تو جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں نے ان دنوں انگریزوں کے خلاف پرامن جنگ کا ایک محاذ قائم کر رکھا تھا اور افغانستان کے حالات بھی سیاسی اعتبار سے قطعاً اچھے نہ تھے۔

اسی اثناء میں افغانستان میں مقیم ڈاکٹر عبدالغنی جلالپوری (جو بعد میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل بھی ہوئے) سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالغنی کابل میں حبیبیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ ایک سال بعد افغانستان میں ان کی مخالفت شروع ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں افغانستان چھوڑنا پڑا اور ادھر ہندوستان میں ان کا داخلہ بالکل بند تھا۔ مولانا محمد علی ایم۔اے کینٹب شروع سے مجاہدانہ طبیعت کے مالک تو تھے ہی، بنابریں اب وہ ثمر قند کی جماعت مجاہدین سے جا ملے۔ مجاہدین کے سینوں میں جہاد کا بے پناہ جذبہ اور ولولہ موجزن تھا۔ ان کے امیر محاذ جنگ اور حالات حاضرہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی نے وہاں پہنچ کر انگریزوں کے خلاف تیغ زنی اور شمشیر بازی کے ذریعہ باقاعدہ دست بدست جنگ کی تربیت کی طرح ڈالی۔ ان دنوں پنجاب کا گورنر سر مائیکل ایڈوائر تھا۔ جس نے تین سال بعد ان پر سے پھر ہندوستان میں داخلہ کی پابندیاں اٹھالیں۔

ہندوستان میں آکر انہوں نے سیاسی جماعتوں سے مل کر اپنی سرگرمیاں اور بھی تیز کر دیں۔ ان کے برادر اصغر محمود علی بیرسٹر پنجاب کے سیاسی حلقوں میں ان کا اہم مقام تھا۔

1911ء میں مولانا محی الدین احمد قصوری نے نمایاں حیثیت سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ بعدازاں 1912ء میں اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا مگران کی حریت پسند طبیعت ملازمت کو بھلا کیسے پسند کر سکتی تھی؟ چنانچہ یہ ہیڈ ماسٹری کسی طرح بھی ان کے ذوق کی تسکین کا ذریعہ ثابت نہ ہو سکی اور ابھی اس پر دو سال کا عرصہ بھی گزرنے نہیں پایا تھا کہ اس نوکری سے دست بردار ہو گئے۔

یہ تو پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان کے پورے خاندان کے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ بہت گہرے تعلقات تھے۔ دوستی اور مراسم کے اعتبار سے یہ مولانا کے اور مولانا ان کے تھے۔ 1912ء میں مولانا آزاد نے کلکتہ سے ''الہلال'' کا پرچہ جاری کیا جو میدان صحافت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ 1913ء میں ''الہلال'' نے ''البلاغ'' کا روپ دھار کر نہ صرف صحافت کی دنیا میں ایک ہلچل مچادی بلکہ مولانا کی پرجوش تحریروں نے مسلمانوں کے سینوں کو گرما دیا، روحوں کو تڑپا دیا، نیز ان کی حمیت اور جذبات کے تمام بند توڑ دیے۔ مولانا حسرت موہانی نے کیا خوب کہا ہے:

جب سے دیکھی ہے ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور ان کے چہیتے شاگرد رشید!

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ؒ اور ان کے شہرۂ آفاق ہمعصر و ہمدم مولانا حنیف ندوی گاہِ بگاہِ، مؤقر ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے مدیر رہے جبکہ نائب مدیر کے عہدے پر مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب ہی جلوہ افروز رہے۔ دونوں ہی اپنے زمانہ میں علمی دنیا کے منجھے ہوئے انشاء پرداز اور مشہور و معروف اہل قلم تھے، گویا آسمان علم و عرفان کے درخشندہ ستارے تھے۔

امریکہ میں رہ کر نیویارک شہر کی زمین دوز پتال ٹرین میں بیٹھ کر بڑی عجلت و سرعت کے ساتھ یہ تحریر کرتے ہوئے مجھے انتہائی مسرت و شادمانی محسوس ہو رہی ہے کہ مؤخر الذکر یعنی مؤرخِ تحریکِ اہلِ حدیث مولانا اسحاق بھٹی صاحب آج بھی ہماری اس مادی دنیا میں بڑی شان و شوکت، آن بان اور طمطراق سے اپنے سیال قلم کی جولانی کے مظاہرہ میں سرگرم اور مصروف ہیں۔ لطف یہ ہے کہ وہ اپنی حیات مستعار کے اس مرحلہ میں بھی نہ تو کبھی اپنے زور دار قلم کی جولانی و سیل روانی میں جسمانی تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں اور نہ ہی ذہنی درماندگی سے دوچار ہوتے ہیں۔ اللہ پاک کی یہ کتنی بڑی کرم فرمائی ہے کہ ان کی شہ کار تصنیفات کو جتنی بھی داد سے نوازا جائے کم ہے۔ مگر افسوس ضرور ہے کہ ان کے دونوں مخلص و خیر اندیش استاد مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور مولانا حنیف ندوی مدتوں قبل سب کو داغ مفارقت دے کر اس آب و گل

کی دنیا سے کنارہ کش ہو کر داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے دار الخلد کی طرف ہمیں سوگوار چھوڑ کر چل بسے۔انا للہ وانا الیہ راجعون!

خوش بختی و خوش قسمتی البتہ اس بات میں پنہاں ہے کہ جناب مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کی نگارشات کے توسط سے ان کے مرحوم استاد اب قارئین کے دلوں میں چلتے پھرتے ہیں۔ان مرحوم استادوں سے میری مراد مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور مولانا حنیف ندوی ہیں۔

جہاں تک مولانا حنیف ندویؒ کا تعلق ہے تو ان کی یاد میں حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب نے "ارمغانِ حنیف" کے نام سے 372 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم شاہکار شائع فرمایا۔اس میں مولانا حنیف ندوی کی حیات مستعار کی ساری تفصیلات منظر عام پر آئیں۔ اسی طرح عطاء اللہ حنیف بھوجیانی پر بھی مضمون لکھ کر "نقوش عظمت رفتہ" نامی کتاب میں شائع فرمایا۔یعنی حنیف بھوجیانی اور حنیف ندوی دونوں شخصیات کا تعارف و تشخص لفظ "حنیف" سے ہی ہوا اور میں ذاتی طور پر اس لفظ "حنیف" کے خدوخال سے بہت ہی متاثر و مانوس ہوں۔

حضرت مولانا عطاء اللہ بھوجیانی کی بات ہو رہی تھی "حنیف" ان کا تخلص تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد گوجرانوالہ کی درس گاہ میں ایک معلم کی حیثیت سے ملازمت شروع کر دی۔ پھر 1933ء میں گوجرانوالہ کی مسند تدریس کو خیر باد کہہ کر کوٹ کپورہ والوں کے متواتر اصرار پر وہ وہاں جا پہنچے۔ پھر وہاں کی جامع مسجد کا خطبۂ جمعہ نیز وہاں کی عظیم درس گاہ میں تدریس کی ذمہ داری بھی اپنے ہی ذمہ لے لی۔ ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ان کی شہرت و نیک نامی چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔

اب تشنگانِ علوم دہلی، یو۔پی، سی۔پی وغیرہ جیسے دور دراز مقامات سے اپنی اپنی علمی پیاس بجھانے کی خاطر کوٹ کپورہ کشاں کشاں پہنچنے لگے۔

چنانچہ مولانا عطاءاللہ عرصہ دراز تک اس کوٹ کپورہ کی جامع مسجد کے خطبۂ جمعہ کے علاوہ مسند تدریس پر بھی جلوہ آفروز رہے پھر 1937ء میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی ؒ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ''مرکز الاسلام لکھوکے'' تشریف لے گئے۔ اس دوران میں چہیتا شاگرد مولانا اسحاق بھٹی، ان کی معیت وصحبت میں برابر شریک رہا۔ اس مرکز الاسلام میں وہ جہاں مولانا اسحاق بھٹی صاحب کو پڑھاتے وہاں اس راقم عاجز کے ہم زلف معین الدین لکھوی اور ان کے بڑے بھائی محی الدین بن محمد علی لکھوی وغیرہ کو بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھاتے تھے۔ بہت بعد میں چل کر ان سطور کے راقم عاجز کو بھی لاہور کے جامعہ سلفیہ میں پڑھانے لگے۔ لیکن لکھوکے میں تقریباً ایک سال قیام کے بعد 1938ء میں پھر وہ اس مرکز الاسلام سے چل پڑے تو فیروز پور پہنچ کر ہی دم لیا۔ خلاصہ یہ کہ مولانا حنیف بھوجیانی جس قدر کرم فرما استاد تھے علامہ اسحاق بھٹی بھی عین اسی قدر ان کے چہیتے وپیارے شاگرد تھے۔

فیروز پور میں ان کی رہائش کی مدت تین سال سے بھی زائد تک رہی۔ وہاں سے چل کر پھر وہ اوڈانوالہ میں صوفی عبداللہ مرحوم کی عظیم درس گاہ جا پہنچے۔ صوفی مرحوم کے خلوص اور خیر خواہی کے باعث شیخ الحدیث جیسا قابلِ رشک عہدہ بھی ان کے حصہ میں آیا۔ ادھر رمضان المبارک کی رخصتوں میں پھر وہ فیروز پور تشریف لے گئے۔ پھر 1947ء میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور اس طرح سے مسلمانوں کا حسین خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا۔ تو مولانا موصوف اپنے اہل وعیال کے ساتھ فیروز پور کی حدود پار کر کے قصور جا پہنچے۔ یہ سب کچھ تو ہوا مگر اپنے پیارے شاگرد مولانا اسحاق

بھٹی کے بغیر بھلا ان کو امن و چین کیسے نصیب ہوتا؟ چنانچہ ایک فوجی کے ہاتھوں مختصر سا رقعہ بھیجا کہ جلد ہی قصور پہنچ کر مجھ سے ملو ورنہ میری زندگی دو بھر اور اجیرن !اور میرا جینا بھی مشکل!!!

مولانا بھٹی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے بڑی زحمت و کلفت سے قصور پہنچ تو گئے مگر اثنائے طریق میں اس قدر افراتفری، غریب الوطنی، نیز خانماں بربادوں کے ناگفتہ بہ حالات دیکھ کر اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ ان کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ بہر کیف مولانا کا قیام قصور میں زیادہ دن نہیں رہا۔ جلد ہی انہوں نے قصور سے گوندلانوالہ کا رخ کیا اور مدت تک وہیں رہے لیکن گاہے بگاہے قصور میں بھی ان کی آمد و رفت ہوا کرتی تھی۔ 1949ء کے شروع میں مولانا نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے اجراء کے لئے تگ و دو شروع کی اور اسی سال کے ماہ اگست کو اس کا پہلا شمارہ مولانا حنیف ندوی کے زیر ادارت اشاعت پذیر ہوا۔ گوجرانوالہ کے چند باہمت حضرات نے اس کی بڑی سرپرستی کی۔ ان میں سے محترم بزرگ حاجی اللہ دتہ، جناب غلام محمد ڈار، حضرت مولانا محمد اسماعیل، سیٹھ نظام الدین، غلام رسول پنساری وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات اس پرچہ کے سارے اخراجات کے کفیل، ذمہ دار بلکہ اس کے کرتا دھرتا اور سرگرم کارکن تھے۔

ادھر مولانا بھوجیانی گوندانوالہ سے مولانا داؤد غزنوی کے بلاوا پر لاہور پہنچ گئے اور مدرسہ تقویۃ الاسلام کی بھاگ دوڑ اس کے شیخ الحدیث کی حیثیت سے سنبھالی۔ ملک کے طول و عرض اور چپے چپے سے تشنگانِ علوم و معارف ان سے استفادہ کی خاطر کشاں کشاں اور جوق در جوق آنے لگے۔ حتٰی کہ بنگال سے بھی کثیر تعداد میں طویل سفر کی صعوبتیں جھیل کر ان کے ہاں پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک قابل ذکر اور لائق

التفات شخص مولانا حافظ عبد الصمد تھے اور یہ راقم عاجز بھی تھا۔ اتفاق سے ہم دونوں راجشاہی کے تھے اور دونوں ہی مولانا کے بڑے لاڈلے اور اس قدر چہیتے کہ ایک دفعہ وہ اس راقم عاجز کے ساتھ حافظ موصوف سے ملنے کی خاطر بنگال جانے پر بھی تیار ہو گئے۔

1955ء میں تقویۃ الاسلام کی فلک بوس عمارت میں مثالی درس گاہ جامعہ سلفیہ (فیصل آباد میں منتقل ہونے سے قبل) کا آغاز وافتتاح ہوا تو دیگر اساتذہ کے ساتھ ساتھ اس میں وہ بھی خدمت تدریس پر مامور ہوئے۔

1955ء کے اپریل کی ابتدائی تاریخوں میں جمعیت اہل حدیث کی تیسری کانفرنس مولانا اسماعیل غزنوی کی صدارت میں فیصل آباد میں منعقد ہوئی، اس کانفرنس میں جماعت کے مرکزی دارالعلوم کا قیام عمل میں لایا گیا تھا جس کا نام مولانا محمد حنیف ندوی کی تجویز کے مطابق "جامعہ سلفیہ" رکھا گیا۔ فیصل آباد میں جامعۂ سلفیہ کی عمارت چونکہ مکمل نہیں ہوئی تھی اس لئے ابتداء میں تعلیم کا انتظام دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں لاہور میں کیا گیا تھا۔

1953ء تک مولانا بھوجیانی ؒ دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی مسندِ شیخ الحدیث پر متمکن رہے۔ حدیث، رجالِ حدیث، اقسامِ حدیث، شروحِ حدیث غرض تمام علوم حدیث پر ان کی گہری نظر تھی۔ اسی اثناء میں انہوں نے شیش محل روڈ پر اپنا ایک اشاعتی اداہ قائم کیا جس کا نام "المکتبہ السلفیہ" رکھا گیا۔ اخبار کے اجراء کی طرح اشاعتی ادارہ قائم کرنے کی بھی ان کی دیرینہ خواہش تھی۔ کتابوں کی اشاعت کے بارے میں ان کا خاص ذوق تھا اور جو کتابیں اور جس اسلوب کی کتابیں شائع کرنے کے وہ متمنی تھے، وہ بھی خاص نوعیت اور منہج کی تھیں جو انہوں نے مکتبہ سلفیہ کی طرف سے شائع کیں اور اہل علم کے مطالعہ میں آئیں۔

مولانا بھوجیانی کسی سے کتاب خریدتے تو قیمت میں رعایت کے طالب نہیں ہوتے تھے البتہ اگر کوئی ضرورت مند شخص ان کی موجودگی میں کسی کتب فروش سے کتاب خریدنا چاہتا تو اس کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، اسے پیسے دے دیتے۔

مولانا بھوجیانی مکتبۂ سلفیہ میں تشریف فرما تھے اور ان کے صاحبزادے حافظ احمد شاکر بھی مکتبہ میں لوگوں کو کتابیں فروخت کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے کتاب خریدی لیکن اس کے پاس پانچ روپے کم نکلے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پانچ روپے کی قدر و قیمت خاصی ہوتی تھی۔ حافظ احمد شاکر نے ان صاحب سے دوکاندار کے لہجے میں بات کی۔ مولانا بھوجیانی فوراً ادھر متوجہ ہوئے اور جیب سے پانچ روپے نکال کر بیٹے سے کہا: ’احمد! یہ لو پانچ روپے، ان کو کتاب دے دو۔‘

بات محبت میں دور نکل گئی جامعۂ سلفیہ کے تلامذہ کے انتخاب کا مرحلہ آیا۔ طلبہ کے انٹرویو کے سلسلہ میں یہ اعلان ہوا کہ صرف 8 طلبا ہی چنے جائیں گے تاکہ آئندہ چل کر یہی منتخب شدہ طلباء جماعت کی بھاگ دوڑ سنبھال سکیں۔ انتخابی امتحان میں راقم عاجز کو ہی سب سے زیادہ نمبر ملے تھے۔ وذلک فضل اللہ.... بہر کیف انتخابی بورڈ کے جید علماء یعنی ممبران نے بے شمار اور انگنت طلباء میں سے شدید جانچ پڑتال، چھان پھٹک اور پرکھنے کے بعد صرف 8 طلباء کو منتخب کیا۔ ان میں ایک یہ راقم عاجز بھی تھا جو بنگال سے تعلق رکھتا تھا۔ آٹھوں طلباء نے مولانا حنیف بھوجیانی نیز مولانا حنیف ندوی سے جتنی خوشہ چینی کی ہے غالباً کسی اور نے نہیں کی۔ ہم آٹھوں کے جھرمٹ میں مولانا کا وجود ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا ایک دبستان ہی کھل گیا ہے۔

1958ء میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' اور ''تنظیم اہلحدیث'' کے صفحات میں میرا ایک قسط وار طویل مضمون ''امام صاغانی لاہوری'' کے عنوان سے بھی شائع ہوا

تھا۔ مولانا حنیف بھوجیانی نے اسے پڑھ کر بہت سراہا، مجھے داد دی اور میری حوصلہ افزائی بھی فرمائی۔ میں ان دنوں چوک دالگراں کی درس گاہ یعنی جامعہ اہلحدیث کی مسند تدریس کی باگ دوڑ سنبھال کر مدرسِ اوّل کی حیثیت سے کام کرتا تھا کیونکہ میرے بزرگوار محترم و مکرم حضرت مولانا عبداللہ روپڑی صاحب نے اپنی مسند تدریس میں مجھے ہی اپنا خلف الرشید بنا کر حج و عمرہ کے لئے حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے، تو وہاں واپسی میں بڑی دیر کر دی۔ بتایا جا چکا ہے کہ مولانا حنیف بھوجیانی جس طرح مجھ سے پیار والفت رکھتے اسی طرح راجشاہی کے مولانا حافظ عبدالصمد صاحب سے بھی رکھتے تھے۔ حافظ موصوف فارغ التحصیل ہو کر جب اپنے وطن مالوف یعنی راجشاہی کو واپس لوٹے تو مولانا بھوجیانی گاہے بگاہے بلکہ اکثر و بیشتر انہیں بہت یاد کرتے تھے۔ راجشاہی کو واپس لوٹنے تک ''تقویۃ الاسلام'' کے وسیع و عریض ہال میں ساری نمازوں کی امامت کے فرائض حافظ موصوف ہی سرانجام دیا کرتے تھے نہ کہ مولانا حنیف بھوجیانی یا مولانا داؤد غزنویؒ۔ دل لگی ہی سے نہیں بلکہ سنجیدگی سے ایک دن مجھ سے کہنے لگے: میرا جی چاہتا ہے کہ جس طرح بھی بن پڑے لاہور سے راجشاہی پہنچ کر اپنے چہیتے اور لاڈلے شاگرد حافظ عبدالصمد سے ملوں۔ تم بتاؤ اخراجات کتنے آ سکتے ہیں؟ میں نے کہا: مولانا اس مادی دنیا میں ہمیشہ ہی شاگرد اپنے مکرم استاد کی زیارت کے لئے یونہی کجاوہ کستے ہوئے استاد کے حضور باریاب ہوتا ہے مگر آپ کے ہاں تو الٹی گنگا بہنے کی سی بات نظر آتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مولانا کی خالی جیب اگر مانع نہ ہوتی تو وہ ضرور اپنے شاگرد سے ملنے کی خاطر کجاوہ کس دیے ہوتے۔

مولانا بھوجیانی کی خصوصیت یہی تھی کہ وہ سادگی، فروتنی اور عجز وانکساری کے پیکر مجسم تھے۔ مرتے دم تک یہی خصوصیت وعادت مستمرہ بدستور قائم رہی۔ ذرہ

برابر بھی فرق نہ آ سکا۔ سفید کھدر کی قمیص ہی ہر وقت زیب تن کیے رہے۔ ٹخنوں سے اونچا کشادہ اور ڈھیلا ڈھالا تہبند بھی کھدر کا ہی ہوا کرتا تھا اور سر کی پگڑی بھی اسی کھدر کی۔ یعنی لباس، مزاج، طور طریق، رہن سہن، کردار، گفتار غرض ہر چیز میں ہی سادگی تھی۔ 1949ء میں مولانا نے پہلی دفعہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' کو بڑی شان شوکت سے شائع کرتے ہوئے اپنے حلقۂ احباب اور ہم عصروں کے سامنے پیش کیا تو سب نے جذبات و شادمانی سے سرشار ہو کر بڑی تعریف و توصیف کی۔ اصل میں ہفتہ روزہ اخبار یا ماہانہ رسالہ جاری کرنے کا مولانا کو بہت شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لئے انہوں نے قیام پاکستان کے بعد گوندلانوالہ کے زمانہ قیام میں گوجرانوالہ کے ڈی۔ سی۔ او کو درخواست دی۔ کئی ماہ بعد اس کی منظوری ہوئی اور مولانا بھوجیانی نے حجازی پریس لاہور سے اخبار شائع کیا۔ اس وقت اخبار کے ایڈیٹر مولانا ندوی لیکن پرنٹر اور پبلشر مولانا بھوجیانی تھے۔ اس وقت سے لے کر اب تک یہ پرچہ پوری آب و تاب اور باقاعدگی سے شائع ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یوں تو اس عالم اجل کی علمی سرگرمیوں کے ساز کئی سال سے اپنا کام چھوڑ چکے تھے۔ لیکن علمی دنیا کی یہ عظیم شخصیت اور یہ باوقار ہستی 12، 13 اکتوبر 1987ء کی درمیانی شب کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو کر اپنے خالق سے جا ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حیرت و استعجاب تو اس بات پر ہے کہ بسترِ علالت میں کافی نحیف و لاغری کے وقت بھی مختلف جگہوں سے اپنی پسندیدہ کتابیں منگوا کر اُن کا مطالعہ کا سلسلہ برابر جاری و ساری رکھا۔ ذرہ برابر بھی فرق نہ آنے دیا۔ ان کی حیات دنیوی کے چھوٹے بڑے تمام واقعات علم و فضل کے گراں قدر قالب میں ڈھلے ہوئے تھے جو یادوں کا پر نور سرمایہ بن گئے ہیں۔ ان کے دبلے پتلے اور نحیف جسم میں معرفت و ادراک کا ایک سمندر پنہاں

تھا جو ہر آن موجزن رہتا تھا۔ اور اس کی صاف ستھری لہروں سے ایک عالم اپنی تشنگی کے سامان فراہم کرتا تھا اب بھی جب کہ وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے ہیں ان کا سلسلہ فیض جاری ہے اور جاری رہے گا۔ میرے محبوب و منظور نظر نے کیا خوب کہا:

ہو گیا نظروں سے اوجھل آہ مردِ جلیل

ہوں عطا جنت میں ان کو چشمۂ پائے سلسبیل

مولانا صفی الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ

نومبر 2006ء کے اواخر میں میں لاہور سے پی آئی اے ائیر لائن کے ذریعے دہلی پہنچا جہاں شیخ اصغر علی امام مہدی سلفی اور دیگر اہل حدیث رفقاء کی معیت میں چند دن گزارنے کا موقع ملا۔ دہلی کے دورہ میں حضرت مولانا عبدالجلیل عبدالمعید اور ماہر لسانیات مولانا علامہ عبدالقدوس، اطہرابن احمد نقوی وغیرہ حضرات سے ملاقاتیں رہیں۔ اہلحدیث منزل، اہلحدیث کمپلیکس، المعہد العالی، جامع مسجد اہل حدیث اور مکتبہ ترجمان وغیرہ میں بھی اکثر آنے جانے کا موقع ملتا رہا۔

دہلی قیام کے دوران 'ابوالکلام آزاد اویکننگ سنٹر' کے صدر محترم جناب مولانا عبدالحمید رحمانی کی طرف سے بلاوا آیا۔ ان کے ہاں پہنچا ہی تھا کہ اچانک ایک روح فرسا اور جگر خراش خبر سن کر کلیجہ منہ کو آگیا۔ یہ جاں گسل، دل فگار اور جان کاہ اطلاع عالم اسلام کی نامور عظیم شخصیت، مفسر قرآن، مؤرخِ عصر، معروف و مشہور دانشور اور سب سے بڑھ کر شہرۂ آفاق سیرت نگار کی وفاتِ حسرت آیات اور انتقالِ پُر ملال کی تھی۔ فارسی، عربی و اُردو کے اس صاحبِ طرز ادیب و عالمِ بے بدل سے میری مراد حضرت مولانا شیخ صفی الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ کی ذات ستودہ صفات ہے جو طویل علالت کے بعد عالم آخرت کو سدھار گئے۔ آپ کی وفات گویا ہم عصر علمی دنیا کے لیے عظیم سانحہ اور ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ اللہ پاک اُنہیں غریق رحمت کرے، اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین یاربّ العالمین!

مولانا موصوف نے 'مبارکپور' نامی بھارت کے ایک مشہور و معروف دور افتادہ مگر زرخیز و مردم خیز خطہ میں آنکھ کھولی جہاں بہت بڑی منتخب روزگار شخصیات پیدا ہوئیں، جن میں قاضی اطہر مبارکپوری، مولانا عبیداللہ مبارکپوری رحمانی مصنفِ ''مرعاۃ المفاتیح''، حضرت مولانا عبدالرحمن مبارکپوری مصنفِ ''تحفۃ الاحوذی و تحقیق الکلام''، مولانا امین اثری مبارکپوری، مولانا عبدالصمد مبارکپوری، مولانا عبدالسلام مبارکپوری مصنفِ ''سیرۃ البخاریؒ'' وغیرہ جیسے نام قابل ذکر ہیں۔ مولانا ممدوح بھی اسی سلسلۃ الذھب کی ایک کڑی تھے۔

حضرت مولانا صفی الرّحمن کی پیدائش 1942ء کے وسط میں، مبارکپور کی شمالی جانب کئی فرلانگ کے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی گمنام بستی حسین آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے دادا امجد اکبر اور چچا محمد عبدالصمد سے حاصل کی۔ پھر مدرسہ دارالتعلیم میں داخل ہوئے اور ابتدائی درجات کو مکمل کرتے ہوئے مدرسہ احیاءالعلوم مبارکپور میں عربی درجات میں داخلہ لے لیا۔ وہاں دو سال مکمل کرنے کے بعد مدرسہ فیضِ عام مؤناتھ بھنجن میں جو جماعتِ اہلحدیث کا ایک قدیم اور بنیادی تعلیمی ادارہ ہے، تشریف لے گئے۔

مولانا مبارکپوری: تدریس کے میدان میں

1961ء میں اپنی تعلیم مکمل کرتے ہوئے باقاعدگی کے ساتھ جب سند لے کر فارغ التحصیل ہوئے تو بڑی عزت کے ساتھ اسی ادارہ میں مدرّس کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوگئی۔ دریں اثناء وہ فتویٰ نویسی بھی فرماتے رہے اور الٰہ آباد بورڈ کے زیر اہتمام عربی، فارسی وغیرہ کے مولوی عالم و فاضل جیسے سرکاری امتحانات میں بھی شریک

ہوئے اور اپنی غیر معمولی ذہانت و فطانت کی بنا پر ان تمام امتحانات میں اوّل درجے میں کامیاب ہوئے۔

کئی سال تک آپ نے مؤناتھ بھنجن کی دانش گاہ 'مدرسہ فیض عام' میں سنجیدگی و تندہی کے ساتھ تعلیمی و تدریسی فرائض سرانجام دیے۔ پھر آپ کو دارالحدیث الاثریہ میں تعلیمی ذمہ داری سونپی گئی۔ ان تدریسی فرائض کو بحسن وخوبی سرانجام دینے کے دوران آپ نے فنِ خطابت و شعلہ بیانی میں بھی کمال حاصل کیا اور بڑی شہرت پائی۔

1966ء کے اوائل میں مولانا نے مدرسہ فیض العلوم، مسیونی، مدھیہ پردیش میں ایک کامیاب اُستاد اور مدیر ''التعلیم'' کی حیثیت سے اپنی خدمات کا آغاز کیا۔ وہاں تقریباً چھ سال کی مدت گزارنے کے بعد اہل وطن کے شدید اصرار کی وجہ سے اپنے مادرِ علمی مدرسہ دارالتعلیم مبارکپور میں تشریف لے گئے جہاں صدرِ مدرّس اور پرنسپل کے عہدہ پر دو سال تک فائز رہے۔

1974ء میں بنارس میں ریوڑی تالاب کی مرکزی درس گاہِ اہلحدیث، یعنی دارالعلوم الجامعۃ السلفیہ کے کارپردازوں کی طرف سے دعوت موصول ہوئی کہ وہ اپنی تمام تر خدمات و توجہات کو جامعہ سلفیہ کے لئے وقف کردیں۔ چنانچہ وہ اکتوبر 1974ء میں بنارس کے جامعہ سلفیہ پہنچ کر 1988ء یعنی چودہ سال کی طویل مدت تک وہاں درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران آپ ماہنامہ ''محدث'' بنارس کے مدیر مسؤل اور جامعہ کے تحقیقاتی ادارے میں بھی ایک محقق کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ موصوف انتہائی ذہین و فطین اور گوناگوں ممتاز خوبیوں کے مالک تھے۔ جامعہ سلفیہ میں قدم رکھتے ہی ان کی خوبیوں کے جوہر مزید کھلے اور انہیں پھلنے

پھولنے کا موقع مل گیا۔ گویا ان کی ساری صلاحیتوں کو مزید جِلا مل گئی اور تمام مسدود راہیں وا ہو گئیں۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اُنہیں بڑی صلاحیتوں و قابلیتوں سے نوازا تھا۔ وہ بیک وقت ایک قابل مفسر و محدث بھی تھے اور مدرّس و محقق اور مناظر بھی؛ ایک حاذق و ماہر علمِ فرائض بھی اور بلند پایہ سیرت نگار بھی۔ فارسی، اُردو و عربی زبانوں میں اُنہیں یدِ طولیٰ اور بڑی مہارت تامہ حاصل تھی۔ وہ اعلیٰ پائے کے دانش ور، مصنّف، انشا پرداز اور نثر نگار تھے۔ اُن کی قوتِ حافظہ بڑی تیز، پختہ، پائیدار اور مضبوط تھی۔ احادیث کے مختلف درجات، رواۃِ حدیث کے احوال اور لغتِ عربی کے حلِ اشکالات کے سلسلہ میں وہ کلیدی صلاحیت کے حامل تھے۔ بسا اوقات اور بوقتِ ضرورت مختلف اُلجھے ہوئے شرعی و پیچیدہ مسائل کے حل اور سلجھاؤ کی خاطر فتویٰ بھی دیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ ایک مانے ہوئے مفتی بھی تھے۔ ان کے برجستہ اور فی البدیہہ فتاویٰ بھی تسلی بخش ہوا کرتے۔ اجتہاد و استنباط کی قوّت صلاحیت ان کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔

مولانا مبارکپوری کا دورۂ پاکستان

دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں مولانا مبارکپوری نے ملک اور بیرونِ ملک کے بھی دورے اور سیر و سیاحت کی۔ بلادِ خلیج کا تو آپ نے بار بار دورہ کیا۔ تقریباً سولہ سال تک مدینہ منورہ اور سعودی عرب کے دار الخلافہ 'ریاض' میں اقامت پذیر رہے۔ اسی طرح امریکہ، برطانیہ اور پاکستان وغیرہ کا بھی سفر کیا۔

سرزمینِ پاکستان میں اُن کی آخری تشریف آوری اور ورودِ مسعود 21/20 سال قبل یعنی 19 نومبر تا 10 دسمبر 1985ء کو ہوا۔ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیفؒ

بھوجیانی(1909ءتا 1987ء) مؤقر ہفت روزہ 'الاعتصام' کے اس زمانہ (1985ء) میں مدیر مسؤل تھے۔ حضرت مولانا صفی الرحمن مبارکپوری کی تشریف آوری کے موقع پر ان کے اعزاز میں شیش محل روڈ کے دارالدعوۃ السلفیہ میں ایک پُر شکوہ استقبالیہ دیا گیا۔ ہم عصر علمائے کرام و دانشورانِ عظام نے دور دراز علاقوں سے آکر اس تقریب کو رونق افروز بنایا۔

مولانا مبارکپوری امریکہ میں

مولانا صفی الرحمن مبارکپوری کو رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے امریکہ جانے کا موقع بھی ملا۔ یہ واقعہ وسط دسمبر 1983ء کا ہے۔ اس وقت رابطہ کے سیکرٹری جنرل شیخ محمد علی الحرکان تھے جنہوں نے ٹیلی گرام کے ذریعہ شیخ مبارکپوری کو9 تا 12 ربیع الاوّل 1402ھ میں منعقد ہونے والی عالمی سیرت کانفرنس میں باضابطہ شرکت کی دعوت دی۔

امریکہ کی ریاست کیلی فورنیامیں یہ پُر شکوہ کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ رابطہ کے عزت مآب جنرل سیکرٹری نے مولانا کو اس میں تقریر کرنے اور مقالہ پڑھنے کا موضوع بھی بتا دیا تھا۔ اس سدابہار عنوان کا نام تھا: **'سیرتِ نبوی ﷺ اور ہماری زندگی میں اس کے تقاضے'**

امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر آرینج کاؤنٹی میں واقع سیمینار گاہ میں پہنچ کر مولانا موصوف نے جو مقالہ پڑھا وہ واقعی بڑا ہی مؤثر، مدلل اور فکر انگیز تھا۔

اس کانفرنس میں جن دیگر مایہ ناز شخصیات اور قابل قدر ہستیوں نے شرکت کی اور اس اوّلین نشست کو زینت بخشی، ان میں سے دو تو خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

جناب داؤد اسعد اور جناب ڈاکٹر مزمل صدیقی۔ اوّل الذکر فلسطین کے باسی اور رابطۂ عالم اسلامی نیویارک کے معاون ناظم تھے۔ مزید برآں وہ انٹرنیشنل سپریم کونسل برائے مساجد (مکہ مکرمہ) کی شاخ نیز امریکہ و کینیڈا کی مساجد کی براعظمی مجلس کے جنرل سیکرٹری بھی تھے۔ اتنے اہم مناصب اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود مولانا مبارکپوریؒ کے ساتھ ان کا برتاؤ اور معاملہ ہمیشہ ایک خادم اور بندۂ ناچیز سا رہا، کیونکہ سید القوم خادمھم کا راز گویا اسی میں مضمر ہے۔

مؤخر الذکر جناب ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی نے بھی، وہاں کے سب سے بڑے کرتا دھرتا اور سپریم کونسل المجلس الاعلیٰ کے امیر بالا ہونے کے باوجود حضرت مولانا صفی الرحمن مبارکپوری کے ساتھ نہایت منکسر المزاجی، عاجزی و خوش معاملگی کا برتاؤ کیا۔

'الرحیق المختوم' کے تصنیفی مراحل اور مقبولیت

'الرحیق المختوم' ہی وہ تصنیفِ لطیف ہے جس نے مولانا صفی الرحمن کو عظمت اور دوامی شہرت و نیک نامی کی بامِ ثریا پر پہنچا دیا۔ اس کی تالیف و تصنیف کے تاریخی پس منظر میں بھی ایک طویل داستان ہے۔ 1976ء میں کراچی کی بین الاقوامی سیرت کانفرنس کے اختتام پر رابطۂ عالم اسلامی نے سیرتِ نبوی کے موضوع پر مقالہ نویسی کا ایک عالمی مقابلہ منعقد کرنے کا اعلان کیا جس میں دنیا بھر کے اہل علم کو دعوت دی گئی کہ وہ سیرتِ نبوی کے موضوع پر دنیا کی کسی بھی جیتی جاگتی زبان و ادب میں مقالات قلم بند کریں۔ پھر کیا تھا؟ دنیا کے کثیر اہلِ قلم نے فوراً ہی اپنی اپنی بساط کے مطابق عالمی مقابلہ کے لیے مقالات پیش کیے کیونکہ اس عالمگیر مقابلہ کے انعامات بھی

خطیر تھے اور پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی اور پانچویں پوزیشن حاصل کرنے والوں کو علیٰ الترتیب پچاس، چالیس، تیس، بیس اور دس ہزار ریال کے انعامات دیئے جانے کا اعلان کیا گیا تھا۔

مولانا نے جب اس شاہکار تالیف کو ترتیب دیا، اس وقت آپ بنارس کی عظیم دانش گاہ الجامعۃ السلفیہ میں اُستاد تھے۔ دراصل وہاں کے تلامذہ، اساتذہ و اَقارب نے اس کام کے لئے ان سے پیہم اصرار کیا اور یہ اسی پیہم اصرار کا نتیجہ تھا کہ مولانا اس سیرت نگاری کے عالمی مقابلہ کے لئے پوری طرح مستعد ہو گئے۔ پھر جب اس کام کے لئے انہوں نے اپنے سیال قلم کو جنبش دی تو وہ اپنی مادری زبان اُردو میں نہیں بلکہ قرآنِ مجید کی زبانِ عربی یعنی لسانِ مبین میں دی، حالانکہ اس سے قبل ان کو عربی زبان میں تحریر و تصنیف کا کوئی تجربہ نہ تھا۔

جب عربی زبان میں لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا تو روانی و سلاست سے لکھتے ہی چلے گئے کہ گویا یہ ان کی مادری زبان ہو۔

دراصل اُن پر اُن دنوں ایک عجیب سا جنون اور مخصوص کیفیت طاری تھی۔ کتبِ سیر کا پیہم مطالعہ اور تصنیفی لگن سے وہ دیوانگی و سرشاری کا لطف اُٹھاتے تھے۔ کبھی تو وہ سیرت کے حوالہ سے اس موضوع سے متعلق عربی اشعار گنگناتے اور کبھی کسی نص کو دہراتے نظر آتے۔ اس طرح سے کوئی پانچ چھ ماہ کے اندر مسودہ پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا۔ تسوید کے بعد اب ان کے پاس تبییض کی قطعاً فرصت نہ تھی۔ پھر حضرت مولانا عبدالجلیل عبدالمعید علی گڑھی کے کندھوں پر یہ اہم ذمہ داری ڈالی گئی اور اُنہوں نے قلیل سی مدت میں ہی یہ عظیم ذمہ داری بدرجہ اتم و بطریق احسن نبھائی۔

''الرحیق المختوم'' کو جو عالمی و آفاقی مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل ہوئی، وہ یقیناً تائید الٰہی کا ایک عجیب و غریب کرشمہ ہے۔ یہی وہ مایہ ناز و شہرہ آفاق سیرت کی کتاب ہے جس سے متاثر ہو کر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے جنرل سیکرٹری فضیلۃ الشیخ عمر محمد فلاتہ اور امامِ کعبہ کے والد ماجد شیخ عبداللہ بن حمید نے ہندوستان سے انہیں بلا کر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ ﷺ میں ایک عہدہ بھی تفویض کر دیا۔ یہ عہدہ الباحث المحقق یعنی ریسرچ فیلو کا تھا۔

'الرحیق المختوم' پر پہلا انعام

مارچ 1976ء بمطابق ربیع الاوّل 1396ھ کو پاکستان کی سرزمین میں سیرتِ نبویہ کی پہلی کانفرنس کے اختتام کے موقع پر رابطہ عالم اسلامی نے اسی سلسلہ میں ایک عالمی مقابلہ کا اعلان کر دیا جس کی مختلف شرائط پر پورے اُترنے والوں کے انعامات کی تفصیل تو ہم نے سطورِ بالا میں ہی قلم بند کر دی۔ اس طرح سے رابطہ اسلامی کی طرف سے تقسیم انعامات کا یہ اعلان اُنس و محبتِ نبوی سے سرشار اہل علم و دانشوروں کے لئے مہمیز ثابت ہوا چنانچہ اب تو انہوں نے بڑھ چڑھ کر اس مقابلہ میں حصہ لیا۔ چنانچہ اس مقابلہ میں پیش کئے گئے مقالات کی تعداد 171 تک جا پہنچی جن میں سے 84 مقالے صرف عربی زبان میں تھے، کیونکہ یہ قرآنِ مجید کی زبان اور رابطہ عالم اسلامی کی دفتری زبان تھی۔

ان مقالات کی چھان پھٹک، جانچ پڑتال اور استحقاقِ انعام کے لحاظ سے ان کی ترتیب قائم کرنے کے لئے رابطہ عالم اسلامی نے دنیا بھر کے شہرۂ آفاق علماء و دانشوروں

کی ایک کمیٹی تشکیل دی جس کی سفارشات کے مطابق انعام حاصل کرنے والوں کی ترتیب یہ رہی:

1- پہلا انعام: شیخ صفی الرحمن مبارکپوری، جامعہ سلفیہ، بنارس، ہند
الرحیق المختوم بزبانِ عربی

2- دوسرا انعام: ڈاکٹر ماجد علی خان، جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ہند
خاتم النّبیین ﷺ بزبانِ انگریزی

3- تیسرا انعام: ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، وائس چانسلر اسلامی یونیورسٹی، بہاولپور، پاکستان
'پیغمبر اعظم و آخر' بزبانِ اُردو

4- چوتھا انعام: پروفیسر حامد محمود محمد منصور لیمو، مصر
منتقی النقول فی سیرۃ اعظم الرسول ﷺ بزبانِ عربی

5- پانچواں انعام: پروفیسر عبدالسلام ہاشم حافظ، مدینہ منورہ، سعودی عرب
سیرۃ نبی الھدی والرحمۃ بزبانِ عربی

رابطہ عالم اسلامی نے ان کامیاب افراد کے ناموں کا اعلان شعبان 1378ھ میں کراچی (پاکستان) میں منعقد ہونے والی پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس میں کیا، بعد ازاں تقسیم انعامات کے لئے رابطہ نے مکہ مکرمہ میں اپنے مستقر پر امیر سعود بن عبدالمحسن بن عبدالعزیز کی سرپرستی میں 12 ربیع الآخر 1399ھ بروز ہفتہ کی حسین صبح ایک باوقار تقریب منعقد کی۔ امیر سعود، مکہ مکرمہ کے گورنر امیر فؤاد بن عبدالعزیز کے سیکرٹری تھے۔ چنانچہ اس تقریب میں گورنرِ مکہ کے نائب کی حیثیت سے موصوف نے انعامات تقسیم کئے۔

'الرحیق المختوم' اردو زبان میں

سیرت نگاری کے شناور علامہ مبارکپوریؒ جب ملک حجاز کی مقدس سرزمین سے صنم کدۂ ہند میں واپس لوٹے تو پاک وہند اور نیپال وغیرہ کے اردو داں طبقے نے عربی ''الرحیق المختوم'' کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے پیہم تقاضے اور اصرار شروع کر دیا۔ نت نئے مشاغل کے ہجوم سے کچھ لمحات فرصت نکال کر علامہ مبارکپوریؒ نے بذاتِ خود ہی اس محنت طلب کام کو سرانجام دیا اور بنفسِ نفیس ہی اپنی مایہ ناز و شاہکار تصنیف 'الرحیق المختوم' کو اُردو زبان کے قالب میں بڑے شاندار و جاندار پیرائے میں ڈھال دیا۔

اب اس ضخیم اردو مسودہ کی اشاعت کا مسئلہ در پیش تھا۔ 1985ء کے اواخر یعنی 29 نومبر تا 10 دسمبر میں مولانا نے پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ لاہور شیش محل روڈ سے اشاعت پذیر علمی واصلاحی مؤقر مجلہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے مدیر اس زمانہ میں محترم حافظ صلاح الدین یوسف صاحب تھے۔ موقع کو غنیمت جان کر وہاں دارالدعوۃ السلفیہ کے کارپردازوں نے مولانا مبارکپوری کے اعزاز میں ایک پرتپاک استقبالیہ کا انتظام کیا۔ نیز انہوں نے مولانا سے یہ گزارش کی کہ ''الرحیق المختوم'' کے اردو ایڈیشن کو انہیں چھاپنے کی اجازت مرحمت کی جائے تو پھر بڑی فراخدلی سے مولانا نے ان کی درخواست کو شرف قبولیت سے نوازا۔ اب اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی اس حد تک پہنچی کہ اُس وقت سے لے کر اب تک اردو میں اس کے کئی اردو ایڈیشن نکل گئے۔

'الرحیق المختوم' بنگلہ زبان میں

دنیا کی لگ بھگ 9 زبانوں میں 'الرحیق المختوم' کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتاب ہٰذا کی مانگ کس قدر زیادہ ہے۔ مختلف زبانوں میں تراجم وغیرہ کی یہ بہتات وکثرت دیکھ کر مولانا نے دل ہی دل میں یہ سوچا کہ کیوں نہ اسے بنگلہ زبان میں بھی منتقل کردیا جائے؟ کیونکہ پورا بنگلہ دیش، مغربی بنگال، اراکان، آسام اور تریپورا وغیرہ کے بعض حصوں میں بھی یہ زبان بولی جاتی ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے مجھے 1992ء کے اَواخر میں راجشاہی یونیورسٹی کے پتے پر خط لکھا اور فوری طور پر ترجمہ کا کام شروع کرنے کے لئے کہا اور ساتھ یہ لکھا کہ جہاں تک اس کتاب کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کا تعلق ہے تو میں اپنے شاگردِ رشید 'ابن اسماعیل' کو کہہ دوں گا اور رقم بھی ارسال کروں گا۔ واضح رہے کہ یہ وہی ابن اسماعیل صاحب ہیں جنہوں نے جامعہ سلفیہ بنارس میں مولانا ممدوح کے پاس زانوئے تلمذ طے کرتے ہوئے مدتوں علومِ نبویہ کی خوشہ چینی کی تھی۔ انہوں نے مغربی بنگال کے ضلع مرشد آباد و ساگردیگھی کے ایک قصبہ میں 'ہلال بک ایجنسی' نامی کتب خانہ کی بھی داغ بیل ڈالی ہے۔ ابھی میں 'الرحیق المختوم' کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ ہی کر پایا تھا کہ میرے بیٹے پروفیسر ڈاکٹر یوسف صدیق نے مجھے نیویارک بلالیا، لہٰذا مجھے ترجمہ کی یہ ذمہ داری اپنے ایک شاگردِ رشید مولانا شیخ عبدالخالق رحمانی کے سپرد کرنا پڑی۔ اُنہوں نے بعض ہم نواؤں سے مل کر ترجمہ کے اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیا۔

یہاں پر ایک اور شخصیت کا نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے جن کی پیہم مشقت، اَن تھک محنت اور لگاتار صعوبت نے اس کام کو کچھ آگے بڑھایا، وہ راجشاہی پی ٹی ای سنٹر کے پروفیسر جناب سیف الدین احمد ہیں۔ ان کے ساتھ ایک اور قابل قدر ہستی

اور عظیم شخصیت بھی منسلک و شاملِ حال رہی۔اس ہستی سے میری مراد حضرت مولا
معین الدین کی ذات ستودۂ صفات ہے۔ موصوف مغربی بنگال کے مالدہ ضلع میں
کلیاچک کے باسی تھے اور راجشاہی یونیورسٹی سکول میں اسلامیات و عربی کے استاد بھ
تھے۔ وہ صرف میرے چہیتے شاگردِ رشید ہی نہیں بلکہ اور بھی مختلف اطراف سے ا
کے ساتھ میرا گہرا رابطہ اور تعلقات استوار تھے۔

بہر کیف اس طرح ہم سب کی متفقہ جدوجہد اور کدوکاوش سے ''الرحیق
المختوم'' کا بنگلہ ایڈیشن کا مکمل مسودہ تیار ہوگیا۔ بالآخر ہم نے اس مسودہ کو شیخ صف
الرحمن مبارکپوری کے شاگردِ رشید جناب عبداللہ اسماعیل کے حوالہ کیا تاکہ وہ کلکتہ سے
بڑے دیدہ زیب اور دلکش انداز میں زیورِ طبع سے آراستہ کرتے ہوئے خصوصی اشاعت
کا انتظام کریں چنانچہ ہماری قوی توقعات واُمیدوں کے مطابق ایسا ہی ہوا۔ 'الرحیق
المختوم' کے نام سے جب کتاب چھپ کر ہمارے سامنے آگئی تو ہماری شادمانی ومسرت ک
کوئی انتہا نہ رہی۔ ہر دلعزیزی اور مقبولیتِ خاص وعام کا یہ عالم تھا کہ قلیل سی مدت میں
ہی سارے نسخے ختم ہوگئے۔ بنابریں اب دوسرے ایڈیشن کی نوبت آگئی۔ چنانچہ
دوسرا ایڈیشن بھی سابقہ رعنائی و نکھار اور پہلی سی آب وتاب اور دلکشی لیے سرزمی
بنگال کے قارئینِ کرام وخواندگانِ عظام کے رُوبرو نمودار ہوا۔

'الرحیق المختوم' انگریزی میں

مکتبہ دارالسّلام ریاض کے کرتادھرتا جناب محترم عبدالمالک مجاہد صاحب۔
بنی نوع انسان کی دوررس بہبود ومفاد کی خاطر مولانا صفی الرحمن مبارکپوری سے گزار

کی کہ وہ انہیں ''الرحیق المختوم'' کو انگریزی کا جامہ پہنانے کی اجازت مرحمت کردیں۔ مولانا مبارکپوری صاحب نے انہیں برضاورغبت اس کی اجازت دے دی۔

اس طرح سے "The Sealed Nectar" کے عنوان سے ''الرحیق المختوم'' کا انگریزی ایڈیشن چھپ کر جب قارئین و خواندگان کے سامنے نمودار ہوا تو انگریزی زبان والے عش عش کرنے لگ گئے۔

''الرحیق المختوم'' کا بنگلہ و اردو کے علاوہ دنیا کی تقریباً کوئی اور بھی 19/18 زبانوں میں ترجمہ چھپ کر چار دانگ عالم میں پھیل گیا۔ سوڈان کی اُم درمان یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لئے شیخ مبارکپوری پر ضخیم تحقیقی مقالہ قلمبند کیا گیا۔

دراصل شیخ مبارکپوری کی حیات مستعار نے وفا نہیں کی، ورنہ ان کے سامنے بڑے بڑے علمی منصوبے اور پروجیکٹ تھے۔ اکثر و بیشتر کہتے تھے کہ ایک جامع مانع و ہمہ گیر اسلامی تاریخ مرتب ہونی چاہئے جس میں نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ پوری دنیائے اسلام کی تاریخ ہو، جس میں اس اسلام پر گزرنے والے ادوار کے حالات و کوائف بعینہ اسی طرح درج ہوں جن احوال پر رسول عربیؐ انہیں چھوڑ گئے تھے اور بعد میں آنے والے زمانوں میں تغیر و تبدل کا شکار بھی ہوئے۔

پچھلی صدی کے اواخر میں مسلمانانِ عرب و عجم کی عنانِ توجہ بھی اس طرف مبذول ہوئی کہ سیرت نگاری درحقیقت اپنے فن اور لوازم کے لحاظ سے پُل صراط عبور کرنے کے مترادف ہے۔ گزشتہ چودہ سو سالوں میں فن سیرت پر رنگ برنگ و بوقلموں تصانیف معرض وجود اور منظر عام پر آئیں۔ ان میں سینکڑوں کتابیں امتدادِ زمانہ اور مرورِ ایام کی علمی سفاکیوں کے باوجود اپنے ایک خاص علمی و تحقیقی مقام کی حامل

بھی ہوئیں۔ سیرت کی اس فراوانی اور بہتات و کثرت کے باوجود اس موضوع پر ہر لحاظ سے داد تحسین و تحقیق دینے کی گنجائش جوں کی توں باقی رہ گئی۔

افسوس کہ بعض علماء نے سیرت کے نام پر رطب یابس کے کیسے کیسے انبار لگادیئے لیکن ''الرحیق المختوم'' ان سب میں استثناء بن کر ایسے ہی نمایاں اور مستند و معتمد علیہ ہے جیسا کہ گھٹاٹوپ تاریک رات میں مہتاب و ستاروں کی ضوفشانی! حقیقی واقعات کے چناؤ، لوازمے کی فراہمی، ترتیب، تنسیق و اسلوب نگارش کی چاشنی، صحیح ترین منابع، مراجع و مصادر تک کی رسائی وغیرہ نے واقعی اس کتاب کو دیگر کتب سیرت پر فوقیت سے ہمکنار کر دیا۔

روضة الانوار فی سیرة النبیؐ المختار

دار السلام ریاض کے کرتا دھرتا جناب محترم عبدالمالک مجاہد صاحب نے ایک دفعہ صاحب ''الرحیق المختوم'' سے دست بستہ گزارش کی کہ شستہ عربی زبان میں نوجوانوں اور خصوصاً میٹرک کے طلبہ کے لئے ایک مؤجز، مختصر مگر جامع مانع کتاب فن سیرت پر رقم کریں جو عام فہم بھی ہو اور آسان، سلیس و رواں بھی ہو، واقعات صحیحہ پر مبنی بھی ہو، نیز اس کا انداز بیان اس قدر دلفریب ہو کہ نونہالوں کے خانۂ دل میں پیوست ہو کر گویا نقش کالحجر ہو جائے۔

چنانچہ علامہ صاحب نے مجاہد صاحب موصوف کی اس درخواست کو فوراً ہی شرف قبولیت سے نوازتے ہوئے قلیل سی مدت میں 'روضة الانوار فی سیرة النبی المختار' کے عنوان سے ایک عمدہ ترین کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب جب منظر عام پر آئی تو سعودی عرب کے نونہال و نوجوان طبقے نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

دارالسلام ریاض میں خدمات

ادھر کرشمۂ قدرت کو بھی ذرا دیکھئے۔ دسمبر 1998ء کو جوں ہی مدینہ یونیورسٹی کے ساتھ علامہ مبارکپوری کا معاہدہ ختم ہو گیا تو اس کے فوراً بعد ہی جناب محترم عبدالمالک مجاہد صاحب نے انہیں بڑی عاجزی وانکساری کے ساتھ ریاض تشریف لے جانے کی دعوت دی چنانچہ علامہ مبارکپوری صاحب نے اس بلاوا ودعوت پر لبیک کہتے ہوئے ریاض کے لئے رخت سفر باندھ لیا، علامہ صاحب نے مہمان بن کر ریاض کی سرزمین قدم رنجہ فرمایا۔ علامہ مبارکپوری صاحب نے تقریباً 8 سال تک وہاں پر قیام فرمایا۔ اس دوران میں انہوں نے بہت سے اہم علمی و تحقیقی کام بڑی تندہی، انہماک اور سنجیدگی سے سرانجام دیئے۔ کئی کتابوں پر آپ نے نظر ثانی کی اور کچھ اضافہ بھی ہو گیا۔ چند ایک پر مراجعہ کیا۔

صحاح ستہ

سب سے زیادہ اہم اور جان جوکھوں کا کام پورا صحاح ستہ کو یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ (صحیحین اور سنن اربعہ) ترتیب دے کر ایک ہی ضخیم ترین جلد میں لانے کا منصوبہ تھا۔ تمام اسلامی کتابوں کی تاریخ کا غالباً یہ سب سے بڑا منصوبہ تھا۔ اصل مسئلہ اس کی اصلاح و تصحیح کا تھا۔ دارالسلام کی ٹیم اور علمی کمیٹی یہ چاہتی تھی کہ ایک ایسا نسخہ منظر عام پر آکر بہت ہی دیدہ زیب و خوبصورت شکل میں زیور طبع سے آراستہ پیراستہ ہو جائے جو کہ صحیح ترین بھی ہو اور اغلاط سے پاک صاف اور مبرا بھی ہو۔ حضرت العلام مبارکپوری صاحب کو اس علمی کمیٹی کا سربراہ بنایا گیا تھا اور ریکارڈ وقت میں ایسا ہی ایک نسخہ عین منصوبے کے مطابق اٹلی سے اشاعت پذیر ہوا۔

تفسیر ''احسن البیان'' پر نظر ثانی

''تفسیر احسن البیان'' محترم حافظ صلاح الدین یوسف صاحب کی خداداد قرآن فہمی اور احادیث رسول ﷺ کے نور سے مستفید ہونے کے نتیجے کے طور پر سامنے آئی تھی۔ بلا شبہ حافظ موصوف موجودہ عہد کے نامور مصنّف ہیں۔ مجلہ ''الاعتصام'' کی طویل ادارت نے ان کی تحریر میں ایسی پختگی نیز سلاست و روانی کی شیرینی پیدا کی ہے۔ اب جہاں تک ''احسن البیان'' کے عنوان نے اس مختصر مگر جامع و مانع تفسیر کا تعلق ہے وہ جناب حافظ موصوف کے قلم سے ہے۔ اسی طرح اس کے ترجمے کے سلسلہ میں قدیم سلفی تفسیر ابن کثیر کے مترجم نیز یہ بندۂ ناچیز و راقم عاجز کے خسر مرحوم مولانا محمد جوناگڑھی کے ترجمے پر انحصار کیا گیا۔ ترجمہ و تفسیر کے لحاظ سے یہ سلفی منہج اور اہل سنت کے مسلک کا سب سے بہترین اردو نمونہ ہے۔

حضرت مولانا صفی الرحمن مبارکپوری نے ہی اس حاشیے پر نظر ثانی و مراجعہ کی قابل قدر خدمت بھی انجام دی۔ اس طرح سے اس کی ثقاہت دوبالا و دوچند ہوگئی۔ اس طرح سے مکتبہ دارالسلام ریاض میں کئی سال تک قیام فرماکر ایک طرف تو مولانا مبارکپوری نے ''تفسیر احسن البیان'' پر نظر ثانی و مراجعہ کرتے ہوئے اس پر اپنی توثیق و اعتماد کی مہر ثبت کردی۔

شرح ''صحیح مسلم''

اسی زمانہ میں دارالسلام کی فرمائش، خواہش اور مؤدبانہ درخواست پر انہوں نے سلیس عربی زبان میں صحیح مسلم شریف کی شرح لکھی جو ''منة المنعم فی شرح الامام مسلم'' کے نام سے چار جلدوں میں دارالسلام کی طرف سے منظر عام پر آئی۔

اتحاف الکرام

سر زمین مصر کے شہرہ آفاق محدث و مایہ ناز سپوت علامہ ابوالفضیل شہاب الدین احمد ابن حجر العسقلانی کی شاہکار تصنیف ''بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام'' کی عربی تعلیق کا نام ہے ''اتحاف الکرام'' یہ بھی علامہ مبارکپوری کی تخلیق ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ دارالسلام ریاض سے ہی زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

''الرحیق المختوم'' کی تالیف سے قبل ہی ''اتحاف الکرام'' بھارت سے ہی شائع ہوئی تھی۔ پھر جب مکتبہ دارالسلام ریاض نے 1997ء میں اسے دوبارہ شائع کیا تو اس کی آن و بان اور شان ہی کچھ اور تھی۔ اسی سال یعنی 1997ء میں عربی ''اتحاف الکرام'' کا اردو اڈیشن بھی شاندار و جاندار سرورق کے ساتھ مکتبہ مذکورہ ریاض سے منظر عام پر آگیا۔ اسے اردو زبان کا جامہ عالم کبیر جناب محترم عبدالوکیل علوی صاحب نے پہنایا اور پھر خوشنما حسین پیرایہ میں اس کی ادارت کی ذمہ داری کہنہ مشق و شہرہ آفاق سلفی عالم مولانا ارشادالحق الاثری صاحب نے نباہی۔

علامہ مبارکپوری کی لطیف و شاہکار تصنیفات میں سے صرف ''بلوغ المرام'' کی شرح ''اتحاف الکرام'' ہی نہیں بلکہ ان کی دیگر علمی و تحقیقی کتابیں بھی صرف دانش گاہوں کے طلبہ ہی نہیں بلکہ علماء و فضلا بھی ان کی گرانقدر تصنیفات سے بے نیاز و مستغنی نہیں ہوسکتے کیونکہ یہ سب کے لئے یکساں طور پر مفید و کارآمد ہیں۔

ضمیمہ

دہلی کی معروف درس گاہ دارالحدیث رحمانیہ

یہاں مدرسہ رحمانیہ کا ذکر آیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محترم قارئین کے سامنے دارالحدیث رحمانیہ کے قیام کا پس منظر بھی اختصار کے ساتھ پیش کر دیا جائے تاکہ اس مرحوم درس گاہ کی یاد تازہ ہو جائے اور اس درس گاہ کو جاری کرنے اور جاری رکھنے کے پیچھے جن محسنین کی کوششیں کار فرما تھیں انہیں بھی ہم اپنی دعاؤں میں شامل کر لیں۔ یہ درس گاہ اگرچہ تقسیم ملک کے نتیجے میں ختم ہو چکی ہے، لیکن اس کے فیض یافتگان کی وجہ سے اس کا فیض اب بھی جاری ہے اور یہ فیض ہمیشہ جاری رہے گا۔ ان شاء اللہ تعالی۔

دارالحدیث رحمانیہ کی تاسیس کے اسباب و عوامل سے متعلق اکتوبر 1984ء کے ماہنامہ ''محدّث'' (بنارس) میں محمد فاروق اعظمی کا ایک مضمون ''دارالحدیث رحمانیہ دہلی'' کے عنوان سے چھپا تھا اور پھر اس کے تعاقب میں ایک مکتوب بہ عنوان ''دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے قیام کا پس منظر'' ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) کے 11، ستمبر 1987ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

''محدّث'' بنارس کے مضمون نگار کے مطابق دارالحدیث رحمانیہ کا تاریخی پس منظر یوں ہے:

''ماضی قریب میں جماعتِ اہلِ حدیث کے بعض درد مندوں کو اس بات کی سخت تشویش تھی کہ اکابر علمائے اہلِ حدیث ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں، ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں ہے۔ تعلیم و تعلّم کا سلسلہ ٹوٹتا جا رہا ہے اور

ملک کے طول و عرض میں کوئی ایک مثالی اور معیاری سلفی درس گاہ نہیں ہے جہاں باقاعدہ تعلیم و تربیت کا نظم ہو اور آنے والی نسل کو اپنے اسلاف کی نیابت اور عامۃ المسلمن کی قیادت کے لیے تیار کیا جا سکے۔ لہذا مولانا حافظ عبدالعزیز رحیم آبادیؒ نے دہلی کے رئیس کبیر جناب شیخ عبدالرحمن کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ شہر دہلی میں ایک ایسی مرکزی درس گاہ کا قیام عمل میں لایا جائے جو اس خلا کو پر کر سکے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس تجویز کے محرک مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی تھے۔ اوّلیت جن کو بھی حاصل ہو، یہ حقیقت ہے کہ اول روز ہی سے یہ دونوں حضرات اس تحریک کے حامی، مؤید اور فعال رکن رہے، اور اپنے تعاون و اشتراک سے اس تحریک کو تقویت پہنچاتے رہے۔

مدرسے کے قیام کی تجویز ایک ندائے غیبی تھی جو حاجی شیخ عبدالرحمن صاحب کے قلب و جگر میں اتر گئی اور 1339ھ بمطابق 1921ء میں تقریباً ایک لاکھ کے کثیر سرمایہ سے اس کی عمارت بن کر تیار ہو گئی۔"

اب ہفت روزہ "الاعتصام" کا بیان ملاحظہ فرمایئے:

"دارالحدیث رحمانیہ کے اصل محرک ولی کامل حضرت صوفی محمد عبداللہ بانی جامعۂ تعلیم الاسلام، ماموں کانجن (پاکستان) ہیں۔ وہ اس طرح کہ پہلی جنگ عظیم کے وقت خلافتِ عثمانیہ کی حمایت واعانت میں تحریک مجاہدین یعنی جمعیتِ عالیہ چرقند واسمت پیش پیش تھی تاکہ مسلمانوں کا عالمی مرکز خلافت عثمانیہ شکست وریخت سے بچ سکے اور ہندوستان بھی ڈیڑھ صد سالہ غلامی سے نجات حاصل کر سکے۔ دارالعلوم دیوبند کا شمالی سرحدی صوبے اور آزاد قبائل میں بڑا اثر تھا، اس لیے تحریک مجاہدین نے مولانا محمود حسن صاحب کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ فتویٰ دیں کہ ہندوستان دارالحرب ہے، اس فتوے کے ذریعے جمعیتِ مجاہدین ان قبائل کو جہاد پر آمادہ کر سکے گی،

کیونکہ ہندوستان کی فوجی چھاؤنیاں اس وقت خالی پڑی تھیں۔ پورے ہندوستان پر قبضہ کر کے آزاد مملکت قرار دے دینا یا کم از کم خلافت عثمانیہ کو دشمنوں سے محفوظ رکھنا اس طریقے سے ممکن تھا، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس میں دارالعلوم دیوبند کے مشائخ کا اشتراک و تعاون چاہا۔ اس دفعہ اس کام کے لیے جمعیت نے صوفی محمد عبداللہ کی شخصیت کو منتخب کیا۔ صوفی صاحب دیوبند پہنچے، پیغام دارالعلوم کے شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری کی خدمت میں پہنچانا تھا۔ صوفی صاحب کے بیان کے مطابق شاہ صاحب اس وقت ترمذی شریف کی ایک حدیث کی تردید فقہی دلائل کے ذریعے کر رہے تھے۔ صوفی صاحب فرماتے ہیں: ''مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے کہا حضرت آپ ترمذی پڑھا رہے ہیں یا اس کی تردید کر رہے ہیں؟'' علامہ انور شاہ نے مجھ سے کہا تم نے ترمذی پڑھی ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ انہوں نے کہا جب تم نے پڑھی ہی نہیں تو تمہیں کیا معلوم کہ میں تائید کر رہا ہوں یا اس کی تردید کر رہا ہوں؟ میں نے کہا جو آدمی دینی مسائل کا ادنیٰ شعور بھی رکھتا ہے، وہ ایک لمحے میں کتاب کی پڑھائی اور اس کی تردید کا فرق محسوس کر سکتا ہے۔ اتنی سی بات تھی کہ شاہ صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل پٹھان طلبہ مکے، گھونسے اور چاقو لے کر میری طرف لپکے، لیکن میں نے کہا 'میں جماعت مجاہدین کا پیغام علامہ صاحب کے نام لے کر آیا ہوں، مجھے اگر کسی قسم کا گزند پہنچا تو اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار رہو۔' علامہ انور شاہ نے طلبہ کو سختی سے ڈانٹا اور ان کو مجھ پر دست درازی سے منع فرمایا اور طلبہ کو حکم دیا کہ وہ مجھے مہمان خانے میں لے جائیں۔ نیز علامہ موصوف نے فرمایا کہ سبق سے فارغ ہونے کے بعد میں بھی وہاں آ جاؤں گا۔ وہ دونوں لڑکے جن کے سپرد مجھے کیا گیا تھا، کہنے لگے 'حضرت! آپ بڑے خوش نصیب ہیں، اتنی بڑی جسارت کے باوجود بچ گئے، ورنہ آپ ان پٹھان طالب علموں کی خون آشامی کی نذر

ہو جاتے۔' انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم اہل حدیث ہیں، ستر (70) اسی (80) طلبہ اور بھی یہاں پڑھتے ہیں۔ ہم اپنا مسلک چھپا کر اور اپنے کو حنفی ظاہر کر کے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ صوفی صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ تم تعلیم سے فراغت تک اہل حدیث ہی رہتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم میں غالب اکثریت تو حنفی ہو جاتی ہے، البتہ چند وہ طالب علم جن کا گھریلو ماحول خالص دینی، علمی اور مسلکی ہے، وہ ثابت قدم رہتے ہیں، ورنہ ہمارا معاملہ 'ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد' والا ہوتا ہے۔ صوفی صاحب نے فرمایا تم اہل حدیث مدارس میں کیوں نہیں داخلہ لیتے؟ انہوں نے جواب دیا، اہل حدیث مدارس ہیں کہاں جن میں ہم داخلہ لیں؟ جو دو چار ہیں بھی، وہ بھی چند طلبہ سے زائد داخل نہیں کر سکتے۔ اگر ہمارا بندوبست ہو جائے تو ہم تمام اہل حدیث طلبہ دارالعلوم دیوبند سے نکل جائیں گے۔ ''

صوفی صاحب اسی وقت حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادیؒ کے پاس پہنچے کیونکہ وہ جماعت مجاہدین کے رکن رکین تھے اور صوبۂ بہار سے جماعت مجاہدین کی بہت امداد کرتے تھے۔ چنانچہ صوفی صاحب نے حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی سے دردانگیز الفاظ میں سارا ماجرا بیان کیا اور بسط و تفصیل کے ساتھ اپنی معروضات پیش کیں اور ان سے درخواست کی کہ ملک میں جلد از جلد اہل حدیث دینی مدارس کا قیام عمل میں لایا جائے، ورنہ اہل حدیث نسل حنفی ہو جائے گی۔ چنانچہ صوفی صاحب کی تحریک سے مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی نے دربھنگہ (بہار) کے ڈاکٹر سید محمد فرید مرحوم کو مدرسہ قائم کرنے کا حکم دیا اور مدرسہ قائم ہو گیا، جو آج بھی دارالعلوم احمدیہ سلفیہ لہریا سرائے کے نام سے ملک و ملت کی خدمت کی راہ پر گامزن ہے۔ چونکہ یہ مدرسہ بھی اہل حدیث طلبہ کے لیے ناکافی تھا اس لیے حضرت صوفی صاحب کی دلی تمنا ابھی تشنۂ تکمیل تھی، چنانچہ صوفی صاحب

مرحوم مولانا رحیم آبادی کی تائید سے حاجی عبدالرحمن مرحوم کے پاس دہلی پہنچے۔ حاجی عبدالرحمن بھی جماعت مجاہدین کے بہت بڑے ہم نوا اور نہایت مخلص معاون تھے، تمام رؤسائے دہلی کی طرف سے حاجی عبدالرحمن کا مالی تعاون جماعت مجاہدین کے ساتھ تھا، اس لیے حضرت صوفی صاحب کی حاجی عبدالرحمن سے اچھی خاصی شناسائی تھی۔ صوفی صاحب نے ان سے دارالعلوم دیوبند میں پیش آمدہ اپنی آپ بیتی اور وہاں اہل حدیث طلبہ کی بے بسی کا قصہ درد بھرے الفاظ میں سنایا، اور مزید توثیق کے لیے مولانا رحیم آبادی کا زبانی پیغام اور تحریری بیان ان کی خدمت میں پیش کیا۔ حاجی صاحب بہت متاثر ہوئے اور وعدہ فرمایا کہ جلد ہی ایک عظیم الشان دینی ادارہ قائم کیا جائے گا، چنانچہ 1921ء میں حاجی صاحبؒ نے زرِ کثیر صرف کر کے ایک سال کے اندر دارالحدیث رحمانیہ کی عظیم الشان بلڈنگ قائم کر دی۔"

یہ ہے الاعتصام کے مضمون کا خلاصہ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دارالحدیث رحمانیہ کی تاسیس کے سلسلے میں ایک اور مضمون کے بعض اقتباسات اس میں شامل کر دیے جائیں۔ یہ مضمون 14 اور 21 جون 2002ء کے "الاعتصام" کی دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار مکتبہ قدوسیہ اردو بازار، لاہور کے عمر فاروق قدوسی بن مولانا عبدالخالق قدوسی شہید (23 مارچ 1987ء) ہیں۔ مضمون نہایت تحقیق سے لکھا گیا ہے۔ ہر اعتبار سے قرینِ صحت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدرسۂ رحمانیہ سے متعلق صوفی عبداللہ مرحوم کی یا تو پوری بات سننے والے کو یاد نہیں رہی یا پھر انہوں نے اس میں اپنے خیالات شامل کر دیے ہیں۔ اب عمر فاروق قدوسی کے طویل مضمون کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایے:

''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صوفی عبداللہؒ دارالحدیث رحمانیہ کے محرک تھے، یہ بات محل نظر ہے کہ صوفی عبداللہؒ نے مولانا انور شاہ کاشمیری کے درسِ حدیث کو حقیقت میں حدیث پر اعتراض و تنقید قرار دیا ہے۔ اس پر طلباء اشتعال میں آگئے لیکن مولانا کاشمیری نے طلباء کو خاموش کرایا کیونکہ وہ صوفی صاحب کے ''نام اور کام سے واقف'' تھے۔ اس کے بعد صوفی صاحب مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کے پاس گئے۔ انہیں کہا کہ ہمارا اپنا مدرسہ ہونا چاہیے۔ مولانا رحیم آبادی نے صوفی صاحب کی یہ تجویز شیخ عطاء الرحمن اور حاجی عبدالرحمن سے بیان کی اور انہیں آمادہ کیا کہ اپنا ایک مدرسہ قائم کیا جائے۔ اب آیئے اصل معاملے کی طرف! صوفی صاحب کی وفات 1975ء میں ہوئی۔ وفات کے وقت ان کی عمر 90 سال کے قریب تھی۔ صوفی صاحب کاشمیری کے پاس کس سال گئے؟ اس کا واضح پتہ نہیں۔ لیکن اگر حضرت صوفی صاحب کی مولانا کاشمیری سے اس ملاقات کو مان لیا جائے تب بھی بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ مولانا رحیم آبادی کی وفات سے پہلے ہی صوفی صاحب مولانا کاشمیری کے پاس گئے کیونکہ مولانا انور شاہ صاحب سے ملاقات کے بعد وہ مولانا رحیم آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا رحیم آبادی 1918ء میں فوت ہوئے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صوفی صاحب 1918ء میں مولانا انور شاہ کے پاس گئے ہوں گے لیکن اس وقت صوفی صاحب کا بہر حال وہ مقام و مرتبہ نہ تھا، جس پر وہ بعد میں فائز ہوئے اور نہ وہ اس طرح معروف تھے۔ اس لیے ''نام اور کام سے واقفیت'' کہ جس کی بنا پر مولانا انور شاہ نے طلباء کو مشتعل ہونے سے روکا، کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ حضرت مولانا رحیم آبادی کی زندگی کے آخری چند ماہ بیماری کی شدت سے گزرے تھے۔ 17 مارچ 1918ء کو وہ فوت ہوئے۔ ان ایام میں صوفی صاحب اپنے بہن

بھائیوں کی پرورش و تربیت اور ان کی ذمہ داریوں میں الجھے ہوئے تھے۔ یہ
بات محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی نے اپنی اس کتاب میں ذکر کی ہے جو انہوں
نے حضرت صوفی محمد عبداللہؒ پر لکھی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا اہتمام
مکتبۂ قدوسیہ، اردو بازار، لاہور، نے کیا ہے۔"

"صوفی عبداللہ صاحب کی غیر معمولی شخصیت سے قطعاً انکار نہیں۔ بلاشبہ وہ ہمارے اکابر میں نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ جماعتِ اہل حدیث کے لیے انہوں نے بے مثال قربانیاں دیں۔ ان کا صدقہ جاریہ جامعہ تعلیم الاسلام۔ ماموں کانجن آج بھی ہماری جماعت کا اہم ترین مرکز تدریس ہے۔ لیکن دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) کے قیام میں ان کے کردار کی واضح شہادت راقم کو نہیں مل سکی۔ جہاں تک حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کا تعلق ہے، مختلف حالات و واقعات اور شواہد اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ یہ عظیم کارنامہ جو حاجی عبدالرحمن اور شیخ عطاءالرحمن برادران نے انجام دیا، مولانا رحیم آبادیؒ کی ترغیب کا نتیجہ تھا۔"

"جناب محمد فضل الرحمن صاحب سلفی نے اپنی کتاب "مولانا عبدالعزیز رحیم آبادیؒ-حیات و خدمات" میں دارالحدیث رحمانیہ کی وجہ تاسیس ذکر کی ہے۔ ان کے بقول یہ ایک حادثے کا نتیجہ تھا۔ واقعہ اس طرح تھا کہ شیخ عبدالرحمن اور شیخ عطاءالرحمن کے ایک بھانجے ایک مرتبہ گم ہو گئے۔ ان کی تلاش کے لیے جو کوشش کی جاسکتی تھی وہ کی گئی۔ چونکہ وہ امیر ماں باپ کا بچہ تھا، اس لیے اس معاملے میں دولت کی بھی پرواہ نہ کی گئی۔ خدا کی قدرت کچھ عرصے بعد پاربتی پور بنگال کے ریلوے اسٹیشن پر کسی نے اس بچے کو دیکھا تو پہچان لیا۔ اس طرح وہ لڑکا مل گیا۔ محمد فضل الرحمن سلفی لکھتے ہیں کہ "اس بچے کے مل جانے کی خوشی میں یہ لوگ اپنی دولت سے اللہ کا شکر ادا کرنے کا پروگرام بنا

رہے تھے۔ مولانا (عبدالعزیز رحیم آبادی) مرحوم نے مشورہ دیا کہ سب سے اچھا شکرانہ یہ ہے کہ ایک مدرسہ کھول دیں۔ چنانچہ یہ مشورہ ان لوگوں کو بہت پسند آیا اور (حاجی) عبدالرحمن صاحبؒ کے نام کی مناسبت سے مدرسہ رحمانیہ کھول دیا جس کی افادیت سے ہندوستان ہی نہیں، پوری دنیا واقف ہے''۔[1]

''مولانا رحیم آبادی جماعتِ اہل حدیث کے سرخیل تھے۔ سارے ہندوستان میں انہیں اہل حدیث کا رہنما سمجھا جاتا تھا۔ دہلی کے حاجی عبدالرحمن برادران بھی مولانا کے بہت زیادہ عقیدت مند تھے۔ مولانا کا اشارۂ آبروان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ مولانا کی خواہش پوری کرنا وہ اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے دارالحدیث رحمانیہ اسی شان سے قائم کیا، جس کی مولانا آرزو رکھتے تھے۔''

''اب آیئے اس طرف کہ مولانا رحیم آبادی نے شیخ برادران کو مدرسے کے قیام کا مشورہ کیوں دیا؟ وہ کون سے حالات تھے کہ مولانا رحیم آبادیؒ نے اہل حدیث کی ایک مرکزی درس گاہ کی ضرورت محسوس کی؟ یہ تفصیل ہمیں مولانا عبدالغفار کے ایک مضمون سے ملتی ہے۔

مولانا عبدالغفار حسن (م) کا شمار اکابر علمائے اہل حدیث میں ہوتا ہے۔ وہ دارالحدیث رحمانیہ کے فضلاء میں سے ہیں۔ ان کی عمر اس وقت تقریباً 90 سال ہے۔ انہوں نے 1994ء میں ایک مقالہ بعنوان ''ہندوستان کے دینی مدارس'' لکھا جو کہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے دارالحدیث کے متعلق اپنے مشاہدات وتاثرات کا ذکر کیا ہے۔ اس مقالے میں ''دارالحدیث رحمانیہ کی تاسیس کا پس منظر'' بھی انہوں نے بیان کیا ہے۔ چونکہ ان کی زندگی کا طویل عرصہ دارالحدیث رحمانیہ میں گزرا ہے، اس لئے وہ دارالحدیث کے حالات وواقعات سے زیادہ واقف ہیں

اور ان کا بیان زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''ضرورت تھی کہ دینِ اسلام کی صحیح تعلیم اور اعدائے اسلام کے حملوں کو روکنے کے لیے دوسرے فنونِ معقول اور ادب وغیرہ سے مسلمانوں کو بخوبی آگاہ کرایا جائے۔ دہلی ہمیشہ سے علم کا گہوارہ بنا رہا لیکن اس وقت دہلی کی حالت بھی بہت کمزور ہو رہی تھی۔ طلبا کی رہائش و طعام کا کوئی معقول انتظام نہ تھا وہ عموماً مسجدوں میں پڑے رہتے تھے۔ معمولی وظیفہ مل جاتا تھا، جس سے اپنے ہاتھ سے روٹی پکا کر سخت تکالیف برداشت کر کے اپنا پیٹ پال لیا کرتے تھے۔ اہل محلہ کے گھروں میں روٹی مقرر ہو جاتی تھی، جسے خود جا کر لاتے۔ اسی طرح ان کی خودداری اور حریت کے جذبات کو سخت ٹھیس لگتی تھی۔ ہر وقت کسمپرسی، بے بسی اور بے کسی کی حالت میں رہتے۔ ساتھ ہی منقول و معقول کی پڑھائی کا کوئی اعلیٰ انتظام نہ تھا کہ تشنگانِ علم کی پیاس بجھے۔ انہی حالات سے متاثر ہو کر ان نقائص کو دور کرنے کے لیے اور اسلامی تعلیم کو عروج پر لانے کے لیے مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ علمائے اہلِ حدیث یکے بعد دیگرے اٹھتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں۔ تعلیم و تعلّم کے باقاعدہ سلسلے ٹوٹ رہے ہیں، کوئی جامع درس گاہ موجود نہیں، اس لیے کوئی ایسی درس گاہ قائم کی جائے جس کی وجہ سے گزرنے والوں کی نیابت ہو سکے اور جماعت موحّدین قبل از وقت لقمۂ اجل نہ بن جائے۔ چنانچہ یہ تجویز مولانا نے جناب حاجی شیخ عبدالرحمن مرحوم کے سامنے پیش کی، جس کو انہوں نے بسر و چشم قبول کر لیا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوشاں ہو گئے۔''

''اس دور میں جماعت کے بہی خواہوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً ایک مرکزی دارالعلوم کے قیام کا مطالبہ ہوتا رہتا تھا۔ اس کا عنوان ''دارالعلوم کی ضرورت'' تھا۔ مضمون نگار عبدالحفیظ خریدار ''اہلِ حدیث'' (امرتسر) تلشی منڈی (پٹنہ) ہیں۔ اس

مضمون میں بڑی دل سوزی سے جماعت اہل حدیث کے لیے دارالعلوم کی ضرورت کا اظہار کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں ''اگر ہم بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے بھی اسلام کی غرض کے مطابق تربیت پائیں تو ہمیں بھی ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے کہ ایسے دارالعلوم کی بناڈالیں جس میں تعلیم و تربیت دونوں کا سامان ہو اور طلبا جیّد اور صالح علما کے زیر نگرانی رہ کر محدّث، مفسر، فقیہ اور ادیب نکلیں جو عوام اور اغیار کے لیے عمدہ مثال ہوں۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ جو علماء یا صلحاء دنیا سے گزر جاتے ہیں، ان کا کوئی جانشین نظر نہیں آتا۔ وہ جگہ قریب قریب ہمیشہ کے لیے خالی ہو جاتی ہے اور آئندہ کی کیا امید کی جاسکتی ہے؟''

مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی جماعت اہل حدیث کی نامور علمی شخصیات میں سے تھے۔ دارالحدیث کے لیے انہوں نے اپنے احساسات و خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

> ''اللہ رب تغافل! کہ پنجاب بھر میں شاید ہی کوئی ایسا مرکز حدیث ہوگا جس کو صحیح معنوں میں مرکز حدیث کے نام سے معنون کیا جا سکے۔ کمالا یخفی علی اھل گویا یہ نتیجے ہیں فقدان علم کے، موجب ہیں فقدان علماء کے''[2]

مدرسہ رحمانیہ کے بانی شیخ عبدالرحمن و شیخ عطاءالرحمن برادران تھے اور انہیں اس مقصد کے لیے ترغیب دینے میں بنیادی کردار مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کا تھا لیکن اس دور کی بعض اہم جماعتی مرکزی شخصیات بہر حال اس بات کی داعی تھیں کہ ہمارا ایک مرکزی دارالحدیث ہو۔ اس بارے میں مختلف اوقات میں کوششیں بھی ہوئیں لیکن بار آور نہ ہو سکیں۔ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کی ایک تحریر دارالحدیث

سیالکوٹ کے حوالے سے ''گشت اور نشست'' کے عنوان سے 12 جولائی 1918ء کے ''اہل حدیث'' (امرتسر) میں شائع ہوئی۔ اس میں وہ لکھتے ہیں ''حضرات! گزشتہ چند سال میں اہل حدیث میں سے بہت سے چوٹی کے علماء فوت ہو گئے جن کی مسانیدِ خدمت خالی پڑی ہیں۔ کوئی صاحب (گستاخی معاف) ان بزرگوں کی جگہ پُر کرنے کے لائق نہیں تھا۔ اس روز مرہ کے نقصان سے ہمیشہ میری عبرت بین طبیعت کڑھتی رہتی تھی اور آئندہ آنے والے خطرات سے ڈرتی تھی چنانچہ اس کا تذکرہ بارہا برادرِ مکرم مولانا مولوی ثناءاللہ صاحب شیرِ پنجاب اور مکرمی جناب حاجی محمد عبدالغفار صاحب دہلوی مالک مکان حاجی علی جان صاحب مرحوم اور حاجی عبدالرحمن صاحب سوداگر آنریری مجسٹریٹ دہلی وغیرھم اعیانِ قوم سے کیا۔ جن کی دور اندیش نگاہ نے دہلی میں ایک مدرسہ کھولنا تجویز کیا، جس میں علومِ عربیہ باقاعدہ تجویز کیے جاویں اور ضرورت زمانہ کے مطابق اسلامی تمدّن وطریقِ معاشرت کی خوبیاں ان کے ذہن نشین کرائی جائیں۔''

''یہاں یہ بات پیشِ نگاہ ہے کہ 1906ء میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا قیام عمل میں آتا ہے۔ ہمارے اکابر جماعت کی دارالعلوم کی خواہش ایک عشرے سے زائد مدت پر محیط تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ افراد جماعت تو وہی تھے لیکن وہ خواہش اور کوشش کے باوجود جلد دارالحدیث کے قیام میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جیسا کہ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کے حوالے سے مولانا عبدالغفار نے ان حالات کا ذکر کیا ہے، جن کی وجہ سے دارالحدیث رحمانیہ کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی، حالات کا تقریباً اسی طرح کا نقشہ حضرت شیخ الاسلام امرتسریؒ نے بھی کھینچا ہے۔ وہ اکتوبر 1919ء کے ''اہل حدیث'' میں لکھتے ہیں:

"عرصے سے چاروں طرف سے سوالات کی بھرمار تھی کہ اہل حدیث کانفرنس کوئی اپنا دارالحدیث بنائے جس میں علومِ عربیہ خصوصاً تفسیر وحدیث کی تعلیم اعلیٰ طور پر دی جائے۔ علمائے حدیث کی کمی دیکھ کر یہ خواہش قدرتی تھی اور کانفرنس اس خواہش کو بڑی وقعت سے دیکھتی اور سنتی تھی۔ اس خواہش کے پورا کرنے سے ممبران کانفرنس غافل نہ تھے۔ خاموشی میں بہت کچھ کوششیں کی گئیں۔ یہاں تک کہ ایک وقت تو تمام مشکلات پر غالب آکر نصاب تعلیم وغیرہ بھی بنایا گیا اور مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے سپرد بھی کیا گیا، لیکن ماشاءالله قدر فکان پھر کوئی مشکل ایسی آن پڑی کہ سب کچھ کیا کرایا رہ گیا۔ مگر قوم کی طرف سے خواہش چونکہ اخلاص مندی سے تھی اور اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی وقت آگیا تھا، اس لیے اس نیک کام کا قرعۂ فال ہمارے مکرم حاجی عبدالرحمن صاحب سوداگر دہلی (صدر کانفرنس) کے نام پڑا کہ آپ نے ایک بہت بڑا قطعۂ زمین صدر بازار کے کنارے پر حاصل کر کے اس پر مدرسہ دارالحدیث کی تعمیر شروع کر دی، جو موصوف کی خواہش سے 25 ستمبر 1919ء کو میں نے بھی دیکھی۔ نیو بھر دی گئی ہے۔ عمارت کا تمام سامان موجود ہے۔ مدرسہ بڑی شان کا بنے گا ان شاءاللہ، جس کے ایک طرف مسجد بھی ہوگی۔ بلکہ جملہ ضروریات اسی میں ہوں گی۔ میں نے اپنا سارا منصوبہ حاجی صاحب سے عرض کر دیا کہ اسی مدرسے میں ایک بہت بڑا کتب خانہ ہو، جس میں ایک طرف مصنفین بیٹھ کر تصنیف کیا کریں اور دوسری طرف تدریس ہو۔ حاجی صاحب موصوف نے بڑی فراخدلی سے فرمایا "جو جو ضرورتیں آپ کے خیال میں ہیں، سب ان شاءاللہ پوری ہو سکتی ہیں۔" حاضرین سے استدعا ہے کہ اس کام کی تکمیل کے لیے دعا کریں۔ خدا اس کے بانیوں اور حامیوں کی سب مشکلات حل کرے اور ان کے نیک ارادوں میں برکت بخشے۔ آمین"[3]

یہ پس منظر تھا اور یہ وہ حالات تھے کہ جن میں دارالحدیث رحمانیہ دہلی کی تاسیس ہوئی۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی 17 مارچ 1918ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوتے ہیں، جب کہ دارالحدیث رحمانیہ کا افتتاح ان کی وفات سے تین سال بعد 19 جولائی 1921ء کو ہوتا ہے۔ یہ وقفہ کیوں؟

اس کی وجہ سے ممکن ہے کسی صاحب کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ مولانا رحیم آبادی کا دارالحدیث رحمانیہ کے قیام سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن مولانا عبدالغفار حسن اور جناب فضل الرحمن سلفی صاحب کی روایات اس خیال کے برعکس ہیں۔ جہاں تک تعلق ہے ان تین سالوں کا یعنی 1918ء سے 1921ء تک کے وقفے کا، اس کے بارے میں حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا ایک بیان اخبار "اہلِ حدیث" (امرتسر) میں 8 جولائی 1921ء کے شمارے میں چھپا۔ دراصل یہ اس بات کی اطلاع تھی کہ مولانا میر سیالکوٹی کا مدرسہ دارالحدیث سیالکوٹ دہلی منتقل ہو گیا ہے۔ مولانا سیالکوٹی لکھتے ہیں:

"عہدِ اسلام سے آج تک دہلی کو یہ فخر برابر حاصل رہا ہے کہ یہ شہر علوم اسلامیہ کی تحصیل کا مرکز رہا ہے۔ مدرسہ دارالحدیث سیالکوٹ جب سیالکوٹ میں کھولا گیا تھا تو اس سے پیشتر دہلی میں اہل حدیث کی ایک بڑی تعلیم گاہ (جس میں علوم عربیہ پورے طور پر پڑھائے جائیں) کھولنے کی تجویز پختہ ہو گئی تھی لیکن ادھر سیالکوٹ میں میرے بزرگ استاد جناب مولانا مولوی ابو عبداللہ عبید اللہ غلام حسن صاحب سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ ناگاہ فوت ہو گئے، جن کے غم میں میں مدت تک بیمار رہا، اور ادھر دہلی میں مدرسے کی عمارت کے لیے جناب حاجی عبدالرحمن، عطاء الرحمن صاحبان سوداگرانِ صدر بازار دہلی نے زمین کا ایک بڑا وسیع ٹکڑا حاصل تو کر لیا لیکن عمارت تیار

نہ ہونے کے سبب یہاں تعلیم کا کام شروع نہیں ہو سکتا تھا۔ ضرورتِ وقتی سے ناچار ہو کر سیالکوٹ ہی میں مدرسہ کھول دیا۔"[4]

مولانا سیالکوٹی کے اس بیان سے جو باتیں واضح ہوتی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ دارالحدیث سیالکوٹ 1918ء کے لگ بھگ شروع کیا گیا۔ دوسرا یہ کہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے قیام کا منصوبہ دارالحدیث سیالکوٹ کے قیام سے پہلے ہی حتمی طور پر طے ہو چکا تھا، بلکہ اس کے لیے زمین بھی خریدی جاچکی تھی یعنی حضرت مولانا رحیم آبادی علیہ الرحمہ کی زندگی ہی میں یہ کام ہو گیا تھا۔ اب مدرسۂ رحمانیہ دہلی کے قیام میں جو رکاوٹ پیدا ہوئی، اس کی نشاندہی بھی مولانا سیالکوٹی فرما رہے ہیں۔ ایک رکاوٹ مولانا کے استاد محترم مولانا غلام حسن سیالکوٹی کی اچانک وفات تھی۔ مولانا نے ان کی وفات کا بہت زیادہ اثر لیا اور بیمار ہو گئے جیسا کہ انہوں نے خود ہی ذکر فرمایا۔ مولانا غلام حسن سیالکوٹی کی وفات 18 جنوری 1918ء کو ہوئی۔ گویا دارالحدیث رحمانیہ کی تجویز جنوری 1918ء سے پہلے کی تھی، جب کہ رحمانیہ کے مجوّز مولانا رحیم آبادی کی تاریخ وفات 17 مارچ 1918ء ہے۔ اگرچہ مولانا سیالکوٹی نے یہ ذکر نہیں فرمایا کہ مدرسہ رحمانیہ کا قیام کس کی تجویز تھی، لیکن دیگر شواہد سے واضح ہے کہ یہ مولانا رحیم آبادی کی تجویز تھی۔

دارالحدیث رحمانیہ کی تجویز اور باقاعدہ قیام کے تقریباً ساڑھے تین سالہ فرق کی ایک وجہ مولانا میر سیالکوٹی نے یہ بھی ذکر فرمائی ہے کہ حاجی عبدالرحمن و شیخ عطاء الرحمن نے مدرسے کے لیے زمین تو خرید لی لیکن عمارت کی تعمیر جلد نہ ہو سکی۔ اس وجہ سے باقاعدہ پڑھائی کا آغاز نہ ہو سکا۔ وہ زمانہ تعمیراتی اعتبار سے آج کل کی طرح کا نہیں تھا کہ جدید مشینری کی بدولت مہینوں کا کام ہفتوں میں اور ہفتوں کا کام دنوں میں

مکمل ہو جائے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس زمانے میں دارالحدیث رحمانیہ کی عمارت اور مسجد پر تقریباً ایک لاکھ روپے صرف ہوئے تھے، جیساکہ مولانا عبدالغفار حسن نے لکھا ہے ''الاعتصام'' (12 اگست 1994ء) ایسی وسیع و عریض تعمیر کا اہتمام کرنے میں کوئی رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس لیے مولانا رحیم آبادی کی تجویز اور مدرسے کے قیام میں تین سالہ وقفہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔

قبل ازیں قارئین ''دارالعلوم اہل حدیث'' کے عنوان سے حضرت مولانا ثناءاللہ امر تسریؒ کی ایک مختصر تحریر ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اس میں وہ لکھتے ہیں ''25 ستمبر 1919ء کو میں نے مدرسہ دارالحدیث دیکھا۔ اس کی نیو بھر دی گئی ہے۔'' مولانا امر تسری کے اس بیان سے یہ بات واضح ہے کہ ستمبر 1919ء تک نہ صرف یہ کہ دارالحدیث رحمانیہ کے لیے جگہ خریدی جا چکی تھی، بلکہ اس پر تعمیر کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ اس وقت مولانا رحیم آبادی کو فوت ہوئے ڈیڑھ برس ہو چکا تھا۔

18 جولائی 1921ء وہ خوشگوار دن تھا جس دن کہ ہمارے اسلاف اور ہمارے اکابر کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ یعنی اس روز دارالحدیث رحمانیہ کا افتتاح ہوا۔ افتتاحی تقریب کا اعلان مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی نے اخبار ''اہل حدیث'' (امر تسر) 8 جولائی 1921ء میں کیا۔ یہ اعلان مولانا سیالکوٹی کے اس بیان کے آخر میں ہے جو انہوں نے ''دارالحدیث سیالکوٹ دہلی میں'' کی اطلاع کے طور پر دیا تھا۔ مولانا نے یہ بیان بطور ناظم وصدر مدرس دارالحدیث رحمانیہ دہلی کی حیثیت میں جاری کیا تھا۔ اس کا افتتاح شیخ الاسلام حضرت مولانا ثناءاللہ امر تسریؒ نے کیا۔ افتتاحی تقریب کی رپورٹ ''اہل حدیث'' (امر تسر) کے 29 جولائی 1921ء کے شمارے

میں شائع ہوئی۔ یہ رپورٹ مولانامیر سالکوٹی کی طرف سے شائع ہوئی۔ رپورٹ یہ تھی:

"مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی کاافتتاحی جلسہ"

"18 جولائی کو مدرسۂ مذکور کاجلسہ بمکان مدرسہ ہوا۔ جناب حاجی عبدالرحمن صاحب بانی مدرسہ نے تحریک کی کہ مولاناثناءاللہ صاحب اس جلسے کے صدر ہوں۔ حاجی عبدالغفار وغیرہ نے تائید کی۔ خاکسار ابراہیم نے اور جناب حافظ عبدالوہاب صاحب دہلوی، مولوی محمد صاحب دہلوی اور مولوی عبداللطیف صاحب مدرس مدرسہ فتح پوری، دہلی وغیرہ نے فضیلت علم میں تقریریں کیں۔ سب سے آخر میں صدر صاحب نے تقریر فرمائی، جس میں آج کل کے دینی مدارس کے طلبا کو مہاجرین اور ان کے مربّیوں اور مدارس کے بانیوں اور معاونین کو انصار سے تشبیہ دی۔ اور کہا کہ یہی دو گروہ عصر حاضر کے مہاجرین اور انصار ہیں۔ خدا ان سے دینی خدمت لیتا ہے۔ تقریر کے بعد صدر صاحب نے افتتاح مدرسہ کااعلان فرمادیا۔ ان کے بعد حافظ محمد صدیق دہلوی نے مدرسے کی ابتدائی تحریکات کاذکر کر کے حسب دستور صدر صاحب کاشکریہ ادا کیا۔ اب مدرسے میں تعلیم شروع ہے۔ سرِدست دو مدرس ہیں۔"[5]

مولانامیر سیالکوٹی نے اس رپورٹ میں جن دو مدرسین کاذکر کیاہے، ان میں سے ایک مولاناخود تھے اور وہ صدر مدرس بھی تھے۔

انہی دنوں دارالحدیث کے بانی حاجی عبدالرحمن و شیخ عطاءالرحمن برادران نے دارالحدیث کی افتتاحی تقریب کااعلان بھی ہفت روزہ "اہل حدیث" میں کیا۔ اس اعلان سے مدرسے کے ابتدائی حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اب قارئین یہ اعلان ملاحظہ فرمائیں:

”خدا کا شکر ہے کہ اب عمارت مدرسہ اور مسجد متعلقِ مدرسہ تیار ہو گئی ہے اور تعلیم شروع ہو گئی ہے جس کا افتتاحی جلسہ ان شاء اللہ 18 جولائی 1921ء کو ہو گا۔ یہ درس گاہ ہم نے اسلامی خدمت کے لیے اپنے زرِ خاص سے تعمیر کی ہے اور اس کے اخراجات بھی ہم اپنی جیبِ خاص سے اٹھانا چاہتے ہیں۔ کسی چندے یا امداد کی خدا کے فضل سے ضرورت نہیں ہے اور یہ درس گاہ جدید تعمیر کی گئی ہے اور مدرسہ بھی جدید کھولا گیا ہے۔ کسی اور جگہ سے منتقل نہیں ہوا۔ چونکہ بعض اصحاب کو اس بارے میں کئی طرح کے شبہات تھے، اس لئے بغرضِ رفع شکوک اس اعلان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ فی الحال ہم نے مختلف ممالک اور خود ملک ہندوستان سے بتفصیل ذیل طلبا کا بہ تعداد پچاس لینا منظور کیا ہے اور اس تعداد کی خوراک اور رہائش کا ذمہ ہم بانیانِ مدرسہ نے خود اٹھانا قبول کیا ہے چونکہ ابھی تک پچاس کی تعداد پوری نہیں ہوئی، اس لیے لائق اور مستعد طلبا کو داخل ہونے کا بہت نادر موقع ہے۔

تعداد طلبا

پنجاب، صوبۂ سرحدی کابل مع وسط ایشیا	14
ممالک متحدہ و صوبۂ بہار	12
ملک بنگال	5
علاقہ ماواڑ	3
گجرات وغیرہ	5
خاص صوبۂ دہلی	2
عرب مع دیگر بلاد اسلامیہ	3
تبت و کشمیر	3

''فی الحال ہم نے دو استاد مقرر کیے ہیں جو معقول اور منقول ہر دو کی تدریس کرتے ہیں۔ باقی دو استادوں کی ہم کو اور ضرورت ہے جو علوم دینیات کے جامع ہوں تنخواہ ان کو ہم حسب لیاقت دیں گے۔''

''علاوہ ان پچاس طلبا کے جن کی خوراک ورہائش کا انتظام ہم نے خود کیا ہے، دیگر طلبا بھی لیے جائیں گے لیکن ان کو اپنی خوراک ورہائش کا خود بندوبست کرنا ہوگا۔ جو طلبا مدرسے میں مستقل رہائش رکھنا نہ چاہیں وہ بھی مدرسے کے اوقاتِ تدریس میں شریک ہو سکتے ہیں لیکن ہم کو طالب علم کی نیک چلنی اور سلامت روی کی بابت کامل اطمینان ہونا ضروری ہے، پیشتر اس کے کہ ہم اس کے داخلے کی اجازت دیں۔'' (خادمانِ قوم حاجی عبدالرحمن و شیخ عطاء الرحمن پسران حاجی کرم الٰہی مرحوم۔، صدر بازار۔ دہلی)

ابتداء میں دارالحدیث رحمانیہ میں دو اساتذہ تھے۔ بعد میں ان میں اضافہ کر دیا گیا۔ اسی طرح ایسے طلباء جو اپنی رہائش وخوراک کا خود بندوبست کرتے، ان کے لیے کوئی تعداد مقرر نہ تھی۔ مدرسۂ رحمانیہ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اساتذہ کی تنخواہیں نہایت معقول تھیں۔ انہیں باوقار طریقے سے زندگی گزارنے کے مواقع حاصل تھے۔ شیخ الحدیث کی تنخواہ 90 روپے ماہانہ تھی، جو اس دور میں اچھی خاصی تنخواہ سمجھی جاتی تھی، جیسا کہ مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی ''تراجم علماء حدیث ہند'' (صفحہ 173) میں لکھتے ہیں: ''اساتذہ کی تنخواہوں کا معیار بلند ہے کہ شیخ الحدیث کو نوے روپے ماہانہ پیش ہوتے ہیں۔ (وقس علی ہذا) ایک وقت میں قریباً آٹھ اساتذہ اور اسی مناسبت سے مناسب تعداد طلبہ داخل کیے جاتے ہیں۔''

دارالحدیث رحمانیہ کے قیام کے کسی مرحلے میں بھی صوفی عبداللہ صاحب کا نام کسی عنوان میں بھی نہیں ہے۔ مضمون کی ہر بات باحوالہ لکھی گئی ہے۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ صوفی صاحب سے واقعہ سننے والے کو پوری بات یاد نہیں رہی اور انہوں نے زائد باتیں تحریر کردیں۔

اس مدرسے کی شہرت عالمی پیمانے پر تھی۔ برِّصغیر کی سرحد سے باہر سے آنے والے طلبہ کا ہجوم بھی یہاں سے اپنی علمی تشنگی بجھا کر واپس جاتا۔ مدرسہ رحمانیہ، دہلی کے صدر مقام باڑہ ہندوراؤ میں قائم تھا۔ آج کے جدید دور میں ہم جسے یونیورسٹی کہتے ہیں، رحمانیہ کا مقام و مرتبہ اس کے برابر تھا۔

شیخ عبدالرحمن اور شیخ عطاءالرحمن دونوں بھائیوں کے ناموں کی مناسبت سے اس مدرسے کا نام ''مدرسۂ رحمانیہ'' رکھا گیا تھا۔ بڑے بھائی شیخ عبدالرحمن کی وفات کے بعد مدرسے کی تمام ذمہ داری شیخ عطاءالرحمن کے کندھوں پر آن پڑی۔ ان کے احساس ذمہ داری، تواضع، خاکساری، للہیت اور خداپرستی کا یہ حال تھا کہ پھاٹک حبش خاں کے اپنے عالی شان مکان سے روزانہ فجر کی نماز کے لیے پیدل چل کر جماعت میں حاضر ہوتے تھے۔ ڈرائیور کی تکلیف کا خیال کرتے ہوئے اسے بیدار کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ آگے چل کر مولانا جوناگڑھی نے مدرسہ رحمانیہ کے متصل اپنی رہائش گاہ تعمیر کرا لی تھی۔

شیخ صاحب کا معمول تھا کہ ہر جمعہ کو جمعہ کی نماز کے فوراً بعد رحمانیہ میں گاڑی بھیجتے، جس کے ذریعے سے مدرسے کے تمام مدرسین ان کے مکان پر پہنچ جاتے اور وہ ان کے ساتھ کھانا تناول فرماتے۔ مدرسے کے اساتذہ کے علاوہ ایک اور شخصیت کو خاص طور پر مدعو کیا جاتا تھا اور وہ شخصیت حضرت مولانا محمد علی جوناگڑھیؒ کی تھی۔

شیخ عطاء الرحمن کے تین فرزند تھے، فضل الرحمن، عبدالوہاب اور حبیب الرحمن۔ فرزندِ کبیر تعلیمی میدان میں کوئی خاص کردار نہ ادا کر سکے۔ باقی دونوں بھائیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور تقسیم ملک کے بعد دونوں بھائی ترک وطن کر کے دہلی سے کراچی چلے گئے تھے۔

شیخ عطاء الرحمن کے انتقال کے بعد ان کے منجھلے فرزند شیخ عبدالوہاب نے مدرسے کی جملہ ذمہ داریاں سنبھالیں۔ انہوں نے بھی جمعہ کے دن اساتذہ کو اپنے محل میں دعوت دینے کا دستور برقرار رکھا، مگر اس میں مولانا محمد جوناگڑھی تشریف نہ لاتے تھے، ان کا کھانا ان کے گھر بھیج دیا جاتا تھا۔

مولانا محمد جوناگڑھی کے مخلص رفقاء میں حافظ حمید اللہ مرحوم کا اسم گرامی متعدد وجوہ سے قابل ذکر ہے۔ ان کے فرزند حافظ محمد یحییٰ صاحب کے مکان پر کچھ عرصہ پیشتر ماضی قریب میں مجھے بھی دعوت طعام میں شرکت کا موقع ملا۔ اس وقت دہلی کے صدر بازار میں ان کا عالی شان مکان تھا۔ حافظ حمید اللہ کی طرح مولانا محمد جوناگڑھی بھی مدرسہ رحمانیہ کے ساتھ گہرا ربط و تعلق رکھتے تھے۔ رحمانیہ کے سخت قوانین کی زد میں آکر نکالے جانے والے طلباء آخر کار مولانا جوناگڑھی کے پاس حاضر ہوتے۔ مولانا انہیں صرف پناہ ہی نہ دیتے بلکہ اپنے میگزین آفس سے متصل کمرے میں رات کو قیام وطعام کا انتظام کرتے اور ان کی تعلیم کا خود ہی اسی طرح اہتمام فرماتے کہ وہ مدرسۂ رحمانیہ میں بعد کو آنے والے امتحان میں آسانی سے شرکت کر سکیں۔ مولانا کی زبان میں مسائل کی تفہیم کا ایسا ملکہ اللہ تعالیٰ نے دیا تھا کہ طلبا آسانی سے ساری بات سمجھ جاتے تھے۔

حواشی وحوالہ جات

1 ۔ محمد فضل الرحمٰن صاحب سلفی، ''مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی''، ص:94

2 ۔ ''اہل حدیث''(امرتسر)،14جون1918ء

3 ۔ ''اہل حدیث'' (امرتسر)،11اکتوبر1919ء

4 ۔ ''اہل حدیث'' (امرتسر)،8جولائی1921ء

5 ۔ خاکسار ابراہیم سیالکوٹی(از مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ) ''اہل حدیث'' (امرتسر) 29جولائی1921ء

اشاریہ

ص

ط

ع

غ

ف

ق

ک

گ

مصادر و مراجع

- بھٹی، محمد اسحاق، ''حرف چند'' مشمولہ 'مولانا محمد علی جوناگڑھی'، (تالیف: محمد مجیب الرحمٰن)، دار الدعوۃ السلفیہ، شیش محل روڈ لاہور، 2003ء
- حالی، الطاف حسین، حیات جاوید، اکادمی پنجاب ٹرسٹ، لاہور، 1957ء
- ذہبیؒ، شمس الدین محمد بن احمد، تاریخ الاسلام، دار الکتاب العربی، بیروت، 1987ء
- سری جوگندر ناتھ سمجھدار و سری رکھال راج رائی، ساہیتیا پنجیکا، کلکتہ، 1312ء
- الکتبی، محمد بن شاکر، فوات الوفیات، دار صادر، بیروت، 1974ء
- محمد اقبال، ڈاکٹر، شکوہ و جواب شکوہ، لاہور، پاکستان
- محمد مجیب الرحمٰن، ڈاکٹر، ''صحافی، ادیب و عالم محمد اکرم خان'' از قلم محمد بن عبد الرحمٰن، کلکتہ مغربی بنگال، انڈیا، 1981ء
- محمد مجیب الرحمٰن، ڈاکٹر، اعجاز القرآن، تیسرا ایڈیشن، ڈھاکہ، 1991ء
- محمد مجیب الرحمٰن، ڈاکٹر، بنگلہ زبان و ادب میں قرآن مجید کا چرچا، اسلامک فاؤنڈیشن بیت المکرم، ڈھاکہ بنگلہ دیش، 1986ء
- A.K. Shamsuddin, ***Otit Diner Smriti***, (1st Ed.) Dhaka 1968.

- Abdul Sattar, Moulana, ***Tafsir name Saityer Apolop***, (1st Ed.), Dhaka.
- Aziz-ul-Haq, Moulana, ***Baje Tafseer***, Dhaka, August 1960.
- M. Abdul-Rehman, ***Theologist Moulana Akram Khan***, (1st Ed.) 1980.
- M. Abdur Rehman, Literature, ***Monishi Moulana Akram Khan***, (1st Ed.) Calcutta 1980
- Muhammad Jahangir, ***Muhammad Akram Khan***, Bangla Academy, Dhaka, February 1987.
- Muhammad Qased Ali, ***Moulana Akram Khan: His life and works***, Arabic Dept. Calcutta University, 1990

اخبارات ورسائل

- روزنامہ "آزاد"، ڈھاکہ، 18اگست1968ء
- روزنامہ "پاکستان"، ڈھاکہ، 1968ء
- روزنامہ "جنگ"، کراچی، 1968ء

- ہفت روزہ "عرفات"، ڈھاکہ، بنگلہ دیش، اگست 1968ء
- ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" (قرآن نمبر)
- ماہنامہ "المجاہد"، دیناجپور بنگلہ دیش، 1986ء
- ماہنامہ "ترجمان الحدیث"، ڈھاکہ، اگست 1986ء
- ماہنامہ "تہذیب"، ڈھاکہ بنگلہ دیش، 1975ء
- ماہنامہ "ستیاراہی"، کلکتہ، 1920ء
- ماہنامہ "محمدی"، اگست 1968ء؛ ستمبر 1969ء
- سالانہ "علوم القرآن"، علی گڑھ، جنوری-دسمبر 1994ء
- مجلہ اسلامی فاؤنڈیشن، بیت المکرم ڈھاکہ، اگست 1969ء

- Monthly "Shariat-e-Islam", 1931
- Monthyl "Muhammadi", 1989.